دیوانِ غالب

نسخۂ خواجہ

— صحیح صورتِ حال —

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

دیوانِ غالب
نسخۂ خواجہ

— صحیح صورتِ حال —

دیوانِ غالب
نسخۂ خواجہ

— صحیح صورتِ حال —

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

الوقار پبلی کیشنز
۵۰- لوئر مال لاہور

<u>ملنے کے پتے :</u>

۱۔ کلاسیک، ریگل چوک، دی مال، لاہور
۲۔ خان بک کمپنی، ۲۵-لوئر مال، لاہور
۳۔ لاء بک ہاؤس، کچہری روڈ، انارکلی چوک، لاہور
۴۔ بک ورلڈ، ۸-یونی پلازہ، دی مال، بہاول پور
۵۔ گندھارہ بکس، خالدہ سردار پلازہ، سید پور روڈ، راولپنڈی
۶۔ مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس ۳۲۳، پشاور
۷۔ کتاب دوست، جاوید منزل ۱/۷/۵۱ ریلوے روڈ، ملتان
۸۔ سفیر اردو، ڈی-۱۲، منیبہ آرکیڈ، بلاک ۷ گلستانِ جوہر، کراچی

سالِ اشاعت : مئی ۲۰۰۰ء
ناشر : الوقار پبلی کیشنز، لاہور
طابع : گنج شکر پریس، لاہور
تعداد اشاعت : ۳۰۰۰
قیمت : ۱۸/- روپے

مندرجات :

"خوشی ہوئی کہ خوش قسمتی سے پروفیسر سیّد مُعین الرحمٰن کو ایسا مطلا و مذہب دیوان مل گیا—— اور پھر مُعین صاحب نے اس کی تدوین ایسی خوبی سے کی ہے کہ تحقیق و تنقید کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رکھا—— مبارک باد! غالب کے اس ایڈیشن کو کبھی کوئی نظر انداز نہ کر سکے گا اور غالب کے نام کے ساتھ یہ بھی ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن نے یہ بہت اچھا کیا کہ خواجہ منظور حسین صاحب کے نام سے اسے منسوب کیا۔ مجھے بھی ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ خوش اخلاق بھی اور شفیق بھی اور دانش ور بھی——"

—— پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

سابق صدر شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

حرفے چند (کچھ اس کارِ ناخوشگوار کے بارے میں) :

پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

لکھتے پڑھتے، پڑھاتے اور چھپتے چھپاتے چالیس برس بیت گئے — اپنے تئیں "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" کی تدوین اور بازیافت سے بہتر کوئی کام، اب تک مجھ سے بَن نہ آیا۔ نہ اس سے زیادہ کسی اور کام پر سزاوارِ تحسین ٹھہرا — ایک کم عمر معاصر تحسین فراقی کی نوکِ قلم نے اس کام پر مجھے جس درجہ "بے پایاں بیداد" کا نشانہ بنایا، وہ بھی انوکھی طرز (دکھری ٹائپ) کا تجربہ ہے۔

- اچھے اطمینان بخش کام کا کر پانا توفیقِ الٰہی کے بغیر ممکن نہ تھا، اس میں میری اسکالر شپ یا شخصی بڑائی کا کوئی دخل نہیں۔ میں ربِ ودود کا احسان مند ہوں۔
- اس کام پر کیا بڑے، کیا چھوٹے، نزدیک اور دور کے اہلِ علم و نظر نے کسی تحفظ کے بغیر جس کھلے دل اور وسعتِ نظری سے داد دی، اسے اپنا استحقاق نہیں جانتا، اسے اللہ اور اس کے کشادہ دل مہربانوں کی طرف سے انعام ضرور خیال کرتا ہوں اور اپنے جذبۂ تشکر کے لیے لفظوں کو ناکافی پاتا ہوں —

○ "بیداد" سے اپنے پیرو مرشد رشید احمد صدیقی کی تعلیم کے نتیجے میں بدحظ یا بے لطف نہیں ہوا۔ "آپ کی پسندیدہ شخصیات (یا موضوعات) کے خلاف کوئی کچھ لکھے یا کہے تو بدحظ ہونے کی بجائے لطف اندوز ہونے کی کوشش کیا کیجئے۔ ایسے کے ساتھ اکثر یہی سلوک کرتے ہیں۔ ممکن ہے غریب کو اس کا احساس نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں کیا لکھ رہا ہے۔" [رشید احمد صدیقی]

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب میرے لیے بڑے محترم بھی ہیں اور مجھ پر مہربان بھی بہت —— انھیں ایک موقع پر ایک ایسے شخص کے اتہامی طرزِ عمل سے، جسے وہ برسوں تک اپنا دوست سمجھتے رہے تھے، حددرجہ تکلیف پہنچی —— انھوں نے اپنے نصیب کے "تحسین فراقی" کا جواب دینے کے لیے جو اسلوب اختیار کیا، وہی سلوک میں اپنے "مقدر کے سکندر" کے ساتھ روا رکھنا چاہوں گا:

"جس شخص کو (برسوں) دوست سمجھا ہو، اس کے خلاف توہین و تحقیر کے الفاظ میرے قلم سے نہیں نکل سکتے۔ ان صاحب کے طرزِ عمل کا مجھے افسوس ہے۔ انھوں نے محاذ بنایا (یا کسی محاذ کا حصہ بنے) تو مجھے بہت رنج ہوا —— مگر میں نے انھیں معاف کیا اور میری دُعا ہے کہ اللہ بھی ان سے مواخذہ نہ کرے —— جو ہمارا دوست نہیں، اللہ اس کا والی ہو —— جو ہمیں رنج دے، اسے بہت سی راحتیں نصیب ہوں۔ جو دشمنی سے ہمارے راستے میں کانٹے بچھائے، اس کی زندگی کے باغ میں ایسے پھول کھلیں جن میں کانٹا نہ ہو ——

میرے لیے یہ بہت ہی ناگوار اور بوجھل کام تھا کہ ان صاحب کی تصحیح یا تردید میں قلم اٹھاؤں — میرے سامنے بہت سے کام ہیں جو ہنوز ادھورے پڑے ہیں اور رخشِ عمر اپنی رَو میں ہے، اس لیے آئندہ اگر وہ یا ان کے فیضِ تربیت کے حامل، کوئی اشقلا چھوڑیں تو مجھے جواب دینے کے لیے پابند نہ سمجھا جائے۔ دوسری التجا یہ ہے کہ آئندہ اگر کوئی صاحب اس موضوع پر قلم اٹھائیں تو وہ ان صاحب کو کسی ناملائم یا نامناسب لفظ سے یاد نہ کریں، یہ مجھ پر کرم ہوگا ...."

لاہور، ۳۰ / اپریل ۲۰۰۰ء

"الوقار" ۵۔ لوئر مال، لاہور ـ ۵۴۰۰۰

"دیوانِ غالب (نسخۂ خواجہ) بہت پسند آیا۔ پروفیسر مُعین الرحمٰن صاحب نے دیوان کی تدوین میں واقعی بڑی محنت کی ہے اور حواشی لکھنے میں جس علمی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں، جنہوں نے تحقیق کے میدان میں عمریں صرف کی ہیں——"

—— پروفیسر ڈاکٹر سیّد سلیمان حسین

سابق صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

(۱)

تحقیق و تنقید ادب میں ایک قابلِ احترام روّیہ تو ہے انہماک کار کا، خود جی لگا کر کام کرنے کا— ایک دوسرا روّیہ ہے خود کچھ نہ کرنا، لیکن دوسروں کے کام میں کیڑے نکالنا— یہ دوسری طرز کے محقق، ناقد اور ماہر بقول شخصے خود تو کچھ کرنے کی اہلیت رکھتے نہیں، ہاں دوسروں کی سعی میں پہلے کیڑے ڈالتے ہیں، پھر کیڑے نکالتے ہیں— اور اپنے ہم نوا بھی پیدا کر لیتے ہیں! "خواجہ دا گواہ ڈڈّو" کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ "ڈڈّو" پنجابی میں مینڈک کو کہتے ہیں جو اپنے ٹرّانے کی واحد شہرت رکھتا ہے، گویا کائنات کا سارا انظام، یا آسمان اسی نے سنبھال رکھا ہے۔

تحسین فراقی (=ت ف) کا ایک گونجتا گرجتا کتابچہ بعنوان : "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ— اصل حقائق" نظر سے گزرا۔ ("حقائق" کیا "غیر اصل" بھی کبھی ہوئے ہیں! یا ہوتے ہیں؟) ساٹھ صفحات کے لگ بھگ کے اس کتابچے پر اشاعت کا سال یا مہینہ درج نہیں۔ اس کتابچے پر "ملنے کے پتے" کراچی سے پنڈی تک کے کئی چھپے ہیں لیکن اس پر کسی پرنٹر کے حوالے کا اندراج نہیں۔ کتابچے پر "جملہ حقوق بہ حق مصنف" کے لفظ نمایاں طور پر درج ملتے ہیں—

تحقیق میں سہو، فرو گزاشت، ترقی اور بہتری سب کا امکان رہتا ہے۔ بابائے اردو نے کہا ہے کہ غلطیاں وہی کرتا ہے جو کچھ کرتا ہے، جو کچھ نہیں کرتا، وہ غلطی کیا کرے گا!— لیکن کمزوری یا غلطی کی نشاندہی علمی خیر اندیشی کے اسلوب پر مبنی ہونی چاہیے۔ اسے روّیے کی بدصورتی پر منحصر یا مرکوز نہ رکھنا چاہیے۔ ت۔ف اور ان کے

قبیل کے "عالموں اور عاملوں" کو اس پر کبھی ضرور غور کرنا چاہیے۔

تحقیقات کا مقصد ڈاکٹر شمیم حنفی کے لفظوں میں "دوسروں کو بے حرمت کرنا تو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مقصودِ اصلی تو علم و ادب کی حرمت کو بچائے رکھنا ہے۔۔۔ لیکن ہمارے ہاں متخصصین کا مقدر بالعموم سنگ زنی اور بے بسی ہی کیوں ہے!؟ پاؤنڈ کا کہنا تھا کہ ناقص اور بے اثر دوائیاں بنانے والا تو سماجی مجرم سمجھا جاتا ہے مگر ناقص رویوں اور خیالات اور معلومات کی اشاعت کرنے والا "عالم اور دانشور" صاف بچ نکلتا ہے۔ جب کہ اس کا وار منافع خور اور جعلی دوائی کمپنیوں کے وار سے آگے جاتا ہے۔"

ت۔ف کی مناظراتی اور اتہامی مزاج کی نگارش "اصل حقائق" کو دیکھ کر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مشفق خواجہ کی طرف دھیان گیا۔ اپنی ہر مشکل اور علمی الجھن میں میرا دھیان بالعموم ان کی جانب ضرور جاتا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب نے ایک موقع پر بتایا ہے کہ :

> "۔۔۔ ایک صاحب ہیں، جن کا کام ہی یہی ہے کہ دوستوں میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ الف کے پاس گئے تو ب کے حوالے سے الف کی برائی کی اور ب کے پاس آئے تو الف کی زبان سے ب کی کردار کشی کی۔ یہ صاحب، ایک روز میرے پاس سے اٹھ کر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پاس گئے تو میرا نام لے کر کچھ "نکتیاں" سنائیں ۔۔۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو فرمان صاحب نے ان سے کہا، "یہ سب کچھ سن کر خوشی ہوئی، کیوں کہ مشفق خواجہ ان لوگوں میں ہیں، جن کی گالیاں

مجھے دُعائیں بن کر لگتی ہیں!——"

میں اپنے آپ کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مشفق خواجہ ہی کے قبیلے کا ایک ادنیٰ فرد سمجھتا ہوں۔ کاش ت۔ف کی ملاحیاں، نکتیاں اور گالیاں مجھے دُعا بن کے لگیں!

(۲)

کوئی علمی اور تحقیقی کام، بالخصوص ادبی و تدوینی کام حرفِ آخر کب ہوا ہے؟ ہزار احتیاط اور کوشش کے باوجود ترقی اور بہتری کا امکان بہر حال رہتا ہے۔ دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ کی متنی تدوین میں مجھے بڑے بڑے ہفت خواں سے گزرنا پڑا—— تحقیقی و تدوینی متن کو صفحہ بہ صفحہ کتابت کرانے، اعراب لگانے، املا کی روش کو ہر جگہ یکساں اور ہموار رکھنے اور تاحدِ امکان اسے کتابت کی اغلاط سے پاک رکھنے میں مجھے بڑی دشواریوں کا سامنا رہا۔ ان سب معاملات و مراحل اور "منازلِ سلوک" پر اب پلٹ کر نظر ڈالتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے اور باور نہیں آتا کہ دیدہ ریزی اور سوزن کاری کا یہ باریک اور مشکل کام، برسوں کے رت جگوں، اپنی کمزور صحت اور دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ، کیوں کر مجھ سے بن آیا—— یہ شاید عشق، شغف اور لگن ہی ہے جس کے بل پر دُنیا میں ان ہونے کام ہوئے ہیں۔ اس کام کی انجام آوری اور تکمیل میں مجھ پر کیا گزری، اس بارے میں خاموش رہنا ہی افضل ہے۔ اس لیے کہ جو جانتے ہیں، وہ جانیں گے اور جو نہیں جانتے (یا نہیں جاننا چاہتے!) وہ بتانے پر بھی کیا جان پائیں گے۔

"دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" کے "حرفے چند" میں یہ عرض اور آرزو کی

تھی کہ :

"متنی تحقیق و تدوین کا یہ کام برسوں کی ریاضت اور محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ تکمیل کا معاملہ تو خیر ایک ان دیکھے موہوم نقطے یا نارسا آرزو کا سا ہے۔ اس کی حد یا منزل کس نے دیکھی اور پائی ہے۔ ہزار احتیاط اور جتن کے باوجود، کور کسر رہ جاتی ہے۔ "ناتمامی" ہی کسی کام اور کارنامے کے "انسانی" ہونے کی پہچان ہے — جو، صاحبِ نظر و خبر ہیں۔ ان سے عفو اور اصلاح کا طالب ہوں اور جن دوستوں کا جی، اس کام سے بہلے اور خوش ہو، ان سے داد اور دُعا کا اُمیدوار ہوں۔ انجام کار جو کچھ بن پڑا، اسے "نسخۂ خواجہ" کے نام سے غالب دوستوں کی نذر کر رہا ہوں۔ یہ کام، جو میری برسوں کی محنت پژوہی اور جاں کاہی کا حاصل ہے، خدا کرے جہانِ غالب میں قابلِ اعتبار ٹھہرے۔" (ص ۷)

میں اللہ اور اس کے بعد اس کے متعدد نیک بندوں کا احسان مند ہوں کہ میری اس کاوش کو دور و نزدیک سراہا گیا اور اس کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہوئی — میرے دو عزیزوں اور عزیز دوستوں سید معراج نیر اور اصغر ندیم سید نے "دیوان غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین" کے نام سے ایک ارمغانِ علمی مرتب کیا جو علی گڑھ، بنارس، لکھنؤ، شاہجہاں پور، ممبئی، دہلی، الہ آباد، ٹوکیو، انقرہ، کراچی، اسلام آباد، لاہور، ملتان، پشاور، شیخوپورہ، مری اور فیصل آباد کے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی پچاس کے لگ بھگ نگارشات، نیز تمیں پینتیس کرم فرماؤں کے مختصر ارتسامات پر مشتمل ہے۔

اس کا کچھ ردِ عمل بھی ہوتا تھا۔ میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے کتابچے کو اس ذیل میں رکھتا ہوں۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا یہ ہے کہ دوسروں کے کارناموں کو:

"بعض عزیز رقیبانہ اور حریصانہ دیکھتے ہیں اور (ان) کی بڑائی میں ان کو اپنی چھوٹائی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے لوگ قابلِ درگزر ہیں۔ اس لیے کہ یہ قلب و نظر کی وسعت نہیں، تعصب ہے—" (خطوطِ رشید احمد صدیقی، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۸)

(۳)

اپنے بے استعداد ہونے کے باوجود "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" کی متن ترتیب و تدوین اور تحقیق پر میں نے برسوں کام کیا۔ یہ مطبوعہ نسخہ بڑے سائز کے ساڑھے تین سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ جواباً ت۔ف کے چھوٹی تقطیع کے کوئی ساٹھ کے لگ بھگ صفحات کے کتابچے "..... اصل حقائق" میں بڑھا چڑھا کر کچھ سو گنوائے گئے ہیں۔ (بعض پر ہندی کی چندی کا محاورہ صادق آتا ہے)— "نسخۂ خواجہ" کی تدوین میں متن اور مفہوم کی نارسائیوں اور تسامحات کی تعداد شاعرانہ غلو کے ساتھ بیسیوں کے حساب سے بتائی گئی ہے۔ (اصل حقائق، ص ۵۹)

اس میں کتابت اور اعراب کے ضبط کی معمولی لغزشوں کو نکال دیں تو قابلِ قبول باتیں دو چار سے زیادہ نہیں رہ جاتیں۔ اس خردہ گیری اور محنت کی داد دیتا ہوں۔ کسی اگلی اشاعت میں ان سے فائدہ اٹھاؤں گا—

ت۔ف نے جہاں "نسخۂ خواجہ" کے مرتب کی نارسائیوں کی دہائی دی ہے۔

وہاں اس "شوقِ فضول" میں متعدد مقامات پر خود ان سے غلطی ہوئی ہے۔ "نسخۂ خواجہ" کی اشاعت (نومبر ۱۹۹۸ء) کے بعد سے اب (اپریل ۲۰۰۰ء) تک کے عرصے میں، تعارف، متن اور تعلیقات کی کچھ ناہمواریاں میری نظر میں بھی آئیں۔ ان میں سے بعض کی جانب ت۔ ف نے توجہ دلائی، بعض ان کی نظر سے بچ گئیں۔

اندازہ کرنا چاہیے کہ بڑے پیمانے کا کوئی کام کرنا کتنا مشکل اور اس پر گرفت مقابلتاً کس درجہ آسان ہے اور اس مہم میں خود لغزشوں کا سرزد ہو جانا بالکل ممکن اور عین تقاضائے فطرت ہے۔ اس سارے معاملے کا پست ترین پہلو یہ ہے کہ "اصل حقائق" کے خالق کا لب و لہجہ استہزائی اور ہلکا زیادہ اور علمی کم تر رہا — دُعا ہے کہ وہ "تنبیہہ الغافلین" بننے اور بنے رہنے کے پھیر اور غول سے نکلیں — اور اللہ تعالیٰ خود انھیں کوئی بنیادی اور بڑا علمی کام کرنے کی توفیق دے تاکہ اپنے علم و فضل اور فارسی دانی کا سرمایۂ غرور کچھ ان کے اور ادب کے "واقعی" کسی مصرف میں آئے! اور شائستگی کے ساتھ سنجیدہ علمی کام کرنا ان کا ہدف اور مقدر بنے۔

ایک حدیث ہے کہ "اچھی اور میٹھی بات بھی صدقہ ہے" — یہ کیسا نصیب اور کیسی بے بسی ہے کہ کوئی شخص اچھی اور میٹھی بات کرنے پر قادر تو ہو لیکن اس پر عمل پیرا نہ ہو سکے! مالک رام کے بقول:

> "درشت کلامی اور سخت زبانی اور استہزا، نہ دلیل و حجت کی جگہ لے سکتے ہیں، نہ اسے تقویت پہنچا سکتے ہیں — ہماری خود غالب کے خلاف یہی شکایت ہے کہ انھوں نے (بعض اہلِ علم) کے لیے تمسخر اور توہین کا لہجہ اختیار کیا —"

"فکر و فرہنگ غالب" کے حامل ت۔ ف ایسے کسی شخص کا ایسا لب و لہجہ

اختیار کرنا کیوں کر مستحسن یا قابلِ تحسین گردانا جاسکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ :

"مصنف سے بیزار ہونے میں مضائقہ نہیں، البتہ فن کے آداب اور تقاضوں سے منحرف ہونا، کسی طور گوارا نہ کرنا چاہیے—"

(۴)

بہت ادب اور احتیاط کے ساتھ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ت۔ف کا یہ مطالعہ مجھے ان کی خوش نیتی سے زیادہ بعض کو خوش کرنے اور نا سمجھوں میں اپنے لیے تالی پٹوانے کے مرض اور خبط کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے اور ان کے قلب و نظر کی وسعت کی خبر نہیں دیتا—

"نسخۂ خواجہ" کی باز نوشت (Transcription) کے ضمن میں ت۔ف نے کچھ اعتراضات کیے ہیں۔ ان میں کتابت کی خفی فروگزاشتوں تک کو انھوں نے بہت اچھالا ہے اور اعراب کے اہتمام پر ایسے اعتراضات کیے ہیں جن میں سے بیشتر سے میں اتفاق نہیں کر پایا۔ ت۔ف لکھتے ہیں :

"نسخۂ خواجہ کے متن میں کہیں کہیں استفہامیہ (؟) کا استعمال ضروری تھی، مگر ایسا نہیں ہو سکا—" (اصل حقائق، ص ۳۶)

اپنے اس اعتراض کے اثبات میں انھوں نے تین مثالیں پیش کی ہیں :

ے تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں

ے تعجب ہے، وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
ے ہے ہے، خدانخواستہ وہ اور دشمنی

ت۔ف کا کہنا ہے :

"ان مصرعوں کے بعد استفہامیہ (؟) نہیں لگایا گیا۔ ان مصرعوں کے آخر میں سوالیہ نشان کا ہونا ضروری تھا—"(ص ۳۶)

میرے نزدیک ان مصرعوں کے آخر میں سوالیہ نشان لگانا، نہ صرف غیر ضروری تھا، بلکہ یہ بدذوقی کے مترادف بھی ہوتا۔ استفہامیہ علامت لگادینا، گویا ان اشعار کے معنوی ابعاد اور ان مصرعوں کی تہداری کو محدود کر دینا ہوتا— یہ پڑھنے والے کے ذوقِ تمیزی پر چھوڑ دینا ہی انسب تھا کہ وہ کب، کس لمحے، کس کیفیتِ ذہنی یا اضطراری وفور میں شعر کو استفہامیہ سطح پر لے، یا کب استعجابیہ، ندائیہ یا فکاہیہ حوالے سے حظ اٹھائے۔

ت۔ف کے نزدیک : "تدوینِ متن کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اگر اصل متن میں کوئی لفظ رہ جائے تو اس متن کی بازنوشت کرتے وقت رہ جانے والا لفظ قلابین [ ] میں لکھا جائے۔ "نسخۂ خواجہ" کے مرتب نے اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا...... (سات) مثالیں حاضر ہیں—"(ص ۳۶)

ہر جگہ ت۔ف کو مغالطہ ہوا ہے۔ ان ساتوں صورتوں کی نشاندہی "نسخۂ خواجہ" کے تعارف میں موجود ہے۔ دیکھئے ص ۲۲، ۲۲، ۲۳، ۲۴ اور ص ۲۴۔

"اصل حقائق" کے ص ۴۱ پر کم از کم سات مصرعے ایسے ہیں جنہیں ت۔ف نے ناموزوں یا غلط ٹھہرالیا ہے۔ لیکن "نسخۂ خواجہ" کے متن میں یہ بالکل

درست ضبط ہوئے ہیں—— کم تر ہی صورت، ت۔ف کے دوسرے ادّعات اور اظہارات میں دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس) سے مجھے فارسی دیباچے اور خاتمے کے ترجمۂ اردو کے کارِ دشوار پر شاباش ملی تھی۔ ت۔ف نے اس کا حوالہ دیا ہے۔(ص ۴۸)اور از خود بھی "داد" دینا ضروری جانا ہے۔ یہاں میں تنہا نہیں، دوسرے بزرگ بھی "نشانۂ تحسین" بنے ہیں۔ ت۔ف لکھتے ہیں :

> "—— فارسی متن...... کے معنی کی تفہیم نہ ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں درست ہے، نہ (ڈاکٹر) ظہور الدین احمد کے یہاں، نہ اعظم علوی کے یہاں اور نہ احمد سعید انصاری ہی کے یہاں۔ جابر علی سید نے بھی اس کا مفہوم غلط سمجھا اور (غلط) ترجمہ کیا——"
>
> (اصل حقائق، ص ۵۲)

موصوف نے ان تراجم کے سلسلے میں متعدد اصلاحیں تجویز کیں اور بے طلب بہت سے مشورے بھی ارزانی فرمائے ہیں۔ انگور بننے سے پہلے منقہ بن جانے کے اس رویے پر مجھے بقول کسے ایک بات یاد آتی ہے کہ "خلیفہ" بن کر کام کرنے کی تلقین کرتے رہنا ممکن ہے، اما ہمات ہو مگر خود کچھ کر کے دکھانا اور کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اہم تر بات ہے۔ "کار" کی مقابل "گفتار" نہیں ہو سکتی! شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر نیر مسعود نے تراجم کے اس کام کو جس اسلوب میں سراہا، یہاں اس کا اندراج بے محل نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے مرتبہ دیوان غالب، نسخۂ خواجہ کے ایڈیشن کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ :

"——اس میں غالب کے اردو دیوان پر ان کے ادق فارسی

دیباچے اور نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کی رنگین فارسی تقریظ کے ترجمے بھی دے دیئے گئے ہیں۔ یہ، دیکھنے میں مختصر تحریریں، جس جاں کاہی اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھوں نے ان کو (خصوصاً غالب کے دیباچے کو) اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور بالآخر ہمت چھوڑ بیٹھے (میں خود بھی ان ناکاموں میں شامل ہوں)۔"

(دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین، ص ۵۰)

"نسخۂ خواجہ" کے "حرفے چند" میں ضمناً ایک قیمتی اور نادر فارسی مخطوطے "معارج النبوۃ" اور اس کے فاضل مصنف ملا معین الدین واعظ الکاشفی الہروی کا ذکر خیر آیا ہے۔ ت۔ف نے اس امر کو بھی زیرِ بحث لانے کا شوق پورا کیا ہے۔ (دیکھئے، ص ۳۸ اور پھر ص ۵۸)۔ اس ضمن میں ان کی اطلاعات محدود اور مستعار ہیں، اس لیے اگر ناقص یا نا تمام ہیں تو قابلِ معافی ہیں۔

(۵)

کتابت / پروف ریڈنگ کی ایک خامی کو ت۔ف نے بہت نمایاں کیا ہے۔ قلمی نسخے کے تعارف میں ایک جگہ یہ لکھا گیا تھا کہ اس نسخے کے :

"......اشعار کی قطعی تعداد ۱۵۴۸ بنتی ہے۔ "قطعات" کے نیم منظوم فارسی عنوانات کو شمار کر لیا جائے تو مجموعی تعداد ۱۵۵۰ سے کچھ اوپر بن جاتی ہے۔" (نسخۂ خواجہ، ص ۱۸)

اس عبارت میں "نیم" کا لفظ کتابت سے رہ گیا ہے۔ حرف گیری کا موقع اللہ ت۔ ف کو دے۔ اس سو پر انھوں نے خوب دند مچائی اور بغلیں بجائی ہیں :

"معین صاحب کی یہ بے خبری نہایت قابلِ افسوس ہے۔ وہ نثر کی مقفّیٰ عبارات کو منظوم عبارات سمجھ بیٹھے — کیا یہ المیہ نہیں کہ کسی شعری مخطوطے کی تدوین کرنے وہ شخص جا رہا ہے جو نثر اور شعر میں امتیاز کرنے سے قاصر ہے۔" دیوان غالب کے نسخۂ خواجہ میں مرتب کے ناموزوں طبع ہونے کے متعدد شواہد ملتے ہیں..... اور یہ معاملہ محض اس تدوینی کام تک محدود نہیں —"
(اصلی حقائق، ص ۳۹)

"نسخۂ خواجہ" کے مرتب کے ناموزوں طبع ہونے کے شواہد فراہم کرنے میں ت۔ ف نے بڑی زحمت اٹھائی۔ اس جوش و خروش اور شوریٰ شوری میں بعض بزرگوں کے سہو قلم بھی انھوں نے میرے کھاتے میں شمار کیے ہیں۔ گرفت کے شوق میں انھوں نے "نسخۂ خواجہ" (ص ۱۰۱-۳۲۵) میں کتابت کے کچھ سہو بھی، مرتب کے "ناموزوں طبع" ہونے کے کھاتے میں ڈال دیے ہیں۔ یہ نہ دیکھا کہ متن کے پاورقی صفحہ نمبر ۸۱، ۱۶۳، ۱۷۵، ۱۸۹، ۲۰۳، ۲۲۷ اور ۲۵۹ پر یہ مصرعے بالکل درست صورت میں ضبط ہوئے ہیں۔

"نسخۂ خواجہ" کے مرتب کی فارسی سے ناواقفیت کا بھی ت۔ ف نے بڑے اونچے سروں میں راگ الاپا ہے — ایم۔ اے (اردو) کے ہمارے زمانے اور ہماری یونیورسٹی کے نصاب میں فارسی اور عربی زبان و ادب کا ایک پورا لازمی پرچہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی اور کہیں میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں فارسی کا منتہی ہوں یا مجھے

فارسی آتی ہے۔ مجھے تبار دودانی کا بھی کوئی دعویٰ نہیں۔

اپنے ہر علمی کام میں مجھے جہاں، اور جب، استفادے اور استعانت یا مراجعت کی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے متعلقہ میدان کے اہلِ علم و نظر سے مشورے اور رہنمائی پانے میں کبھی جھجک سے کام نہیں لیا۔ میں اسے اپنے لیے وجۂ فخر مانتا ہوں کہ پاک و ہند کے متعدد اہلِ نظر سے میرے روابط خوشہ چینی کے ہیں۔ وہ اگر مجھے کچھ اہمیت دیتے ہیں تو یہ ان کی بڑائی ہے۔ اس میں میری علمیت کو کچھ دخل نہیں۔ اپنی کمزوریوں کو میں اپنے عیب جُو محاسبین سے بھی زیادہ خود، خوب جانتا ہوں۔ تمیں پینتیس برس معلّمی کرنے اور تدریسِ ادب کے اعلیٰ مدارج سے وابستہ رہنے کے باوجود، میں آج بھی اپنے آپ کو ادب کا ادنیٰ اور مبتدی طالب علم تصور کرتا ہوں۔

اس گریز اور اعتراف کے بعد کہنا یہ ہے کہ ت۔ف نے ناحق یہ تردّد کیا کہ مجھے ذوقِ شعری سے بے بہرہ اور فارسی سے ناواقف محض ٹھہرانے میں اپنے قیمتی اوقات برباد کیے —— یہ بات انہیں اور انہیں بھی جنہیں وہ "اپنا گرو" کہتے ہیں، معلوم ہے کہ رشید احمد صدیقی میرے لیے کیا حیثیت اور مرتبت رکھتے ہیں۔ رشید صاحب کے ارشادات کو میں اپنا بیانِ واقعی جانتا ہوں :

"میں ان لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک انہیں ناموزوں نہ بنالیا جائے ——"

(رشید احمد صدیقی)

"مجھے شعر یاد نہیں رہتے اور جو یاد آتے ہیں، وہ شعر نہیں صرف سہل ممتنع ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی سہل زیادہ ممتنع کم، اکثر ممتنع زیادہ اور سہل بالکل نہیں ——"   (رشید احمد صدیقی)

ت۔ف، شاعر بھی ہیں، نقاد بھی ــــ رشید احمد صدیقی نے کہیں لکھا ہے کہ :

"میں نے بعض مستند اور عمر رسیدہ شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی برائی بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بازاری فقرے چست کرتے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی خفیف الحرکتی کی داد لینے (کے مشتاق رہتے ہیں)۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہو تو ہو، شاعر میں ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ اس طرح کی حرکت شاعر ہی نہیں کرتے وہ لوگ بھی کرتے ہیں، جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں۔ اور جنھوں نے عمر کا بڑا حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے ــــ بس یہ گوارا نہیں کہ ان کے ہوتے دوسرا کیوں! ــــ"

میں نے رشید صاحب کو نہیں دیکھا ــــ انھیں میں نے ان کی نگارشات کے وسیلے سے جانا۔ میرے لیے رشید صاحب کی تحریریں دستور العمل اور رہنمائے حیات کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے بھی، اچھے، برے، کارناموں اور رویوں کا جواز اور جواب مجھے رشید صاحب سے مل جاتا ہے۔ وہ میرے لیے کیا کچھ نہ تھے ــــ میری زمین، میرا آسمان، میرے نگہبان۔ میری ساری کائنات تھے وہ!

(۲)

امتیاز علی خاں عرشی صاحب کے نزدیک :

"پوری کتاب (نسخۂ لاہور) میں لفظ "اَک" کو "اِک" بدون نقاط

لکھاہے۔"(عرشی، ص ۱۱۵)

مُعین الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے زیرِ نظر "نسخۂ خواجہ" میں بعض جگہ نسخۂ لاہور (متعارفۂ عرشی) سے انحراف ملتا ہے۔"(اصل حقائق، ص ۱۸)

مُعین صاحب کے اعتراض کے ضمن میں دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ کو ص ۱۰ پر کھولیے اور شعر نمبر دو (کا دوسرا مصرعہ) ملاحظہ فرمائیے--- دوسرے مصرعے میں "اَک" ہے مگر اسے کاتب نے "اَیک" (بدونِ نقاط) ہی لکھا ہے اور یوں مُعین صاحب کے برعکس عرشی صاحب ہی کے موقف کی تصدیق (ہوتی) ہے---"(ص ۱۹)

ت۔ف کی خدمت میں عرض ہے کہ: عرشی صاحب نے "نسخۂ لاہور" کے بارے میں بتایا ہے کہ اس میں ہر جگہ (پوری کتاب میں) لفظ "اَک" کو "اَیک" بدونِ نقاط لکھا گیا ہے--- میرا کہنا یہ ہے کہ "نسخۂ خواجہ" میں ہر جگہ (لازماً) اس کی پابندی نہیں کی گئی۔ مثلاً دیکھئے:

(۱) نسخۂ خواجہ کے متن میں ص ۱۴ کے دسویں شعر کے پہلے مصرعے میں عرشی صاحب کے حتمی مشاہدے کے برعکس "اَک" کو نقاط کے اعلان و اظہار کے ساتھ "ایک" لکھا گیا ہے۔

(۲) نسخۂ خواجہ متن ص ۱۹، شعر ۹ کے مصرعۂ دوم میں "اَک" کو نقطوں کے اعلان و اندراج کے ساتھ "ایک" لکھا گیا ہے۔

(۳) صفحہ ۳۱، شعر ۶، پہلا مصرعہ۔

ت۔ف کے بقول:

"معین صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے "نسخۂ خواجہ"
میں ص ۲۰، شعر ۶ کے دوسرے مصرعے میں "خورشید" میں
"واؤ" لکھا گیا ہے— عرض یہ ہے کہ نسخۂ لاہور (متعارفہ
عرشی) میں بھی اسی صفحے کے اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں
"خورشید" میں واؤ موجود ہے۔ اور اس کی نشاندہی خود عرشی کر
چکے ہیں...... لگتا ہے، نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور کے اختلاف
نمایاں کرنے کے اضطراب میں معین صاحب، عرشی صاحب کا
نسخۂ لاہور پر لکھا ہوا مختصر تعارف نامہ بھی غور سے نہیں پڑھ
سکے—" (اصل حقائق، ص ۱۹-۲۰)

عرشی صاحب کی نشاندہی کا اعتراف "نسخۂ خواجہ" کے تعارف (ص ۲۵ اور ص ۲۷) میں موجود ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس نے غور سے نہیں پڑھا اور کون اضطراب میں ہے!

ت۔ف معترف ہیں کہ:

"—بقول معین صاحب (نسخۂ خواجہ) میں لفظ "اک" کو (نقاط کے اعلان کے ساتھ) "ایک" لکھا گیا ہے، تو یہ بات درست ہے۔ ان کی یہ بات بھی درست ہے کہ "نسخۂ خواجہ" میں لفظ کے اوپر عدد کی شکل کا اہتمام (نسخۂ لاہور کے برعکس) ایک آدھ جگہ ہی دکھائی دیتا ہے— ان کا یہ ارشاد بھی بجا ہے کہ نسخۂ لاہور (عرشی) کے برعکس ان کے نسخے (نسخۂ خواجہ) میں مژگاں ہوگا، کے جائے "مژگاں ہونا" درست لکھا گیا ہے—" یہ ہے

اختلاف کی کل کائنات ——"   (اصل حقائق، ص ۲۰)

"اختلافات" کا اعتراف کرنے کے بعد پھر ان "اختلافات" کے ضمن میں جو باتیں ت۔ف کے "ذہن" میں آئی ہیں، اس پر حالی کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے :

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے!

وہ "نسخۂ خواجہ" کو مشکوک یا مسروقہ ٹھہراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ :

"اگر مالِ مشکوک (یا مالِ مسروقہ) ہاتھ لگ جائے تو اسے اپنا ثابت کرنے کے لیے اس میں ترمیم کرنا لازم ہوتا ہے ——"

اپنے اس ایمان اور چلن کو انھوں نے مجھ پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے —— انسان کی یہ کیسی معذوری ہے کہ وہ اپنی نہاد سے اوپر یا اونچا اٹھ سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے! ت۔ف کے اس مذموم اور مزعوم رویے کو بدنیتی یا خبثِ باطن نہ کہیے تو اسے خوش نفسی یا نیک نیتی بھی بہر حال نہیں کہا جا سکتا —— میں اس کا حساب خدائے لایزال پر چھوڑتا ہوں۔ انھوں نے بڑی گرد اڑائی ہے اور فضا بنائی ہے۔ تصحیف، تحریف، تصریف، جعل، بدگمانی، کم علمی کے سارے جالے اور شاخسانے انھیں مبارک ——

(۷)

دیوانِ غالب (اردو) کا ۱۸۵۲ء کا مخطوطہ ۱۹۸۱ء میں مجھ تک آنے سے پہلے جانے کن حالات اور ہاتھوں میں کہاں کہاں رہا —— نہ اس کے سلسلۂ ملکیت کا تمام و کمال تعین ممکن ہے، نہ کسی تحریف کا (اگر وہ اس میں کبھی، کہیں ہوئی)۔ اگر اس میں کوئی تحریف یا ترمیم ہوئی بھی ہے تو ت۔ف کا "مکلف" میں کیوں کر ہو گیا!؟

ت۔ف لکھتے ہیں کہ یہ سوال اٹھنا بے محل نہ ہوگا کہ مُعین الرحمٰن صاحب کو یہ قلمی نسخہ کہاں سے ملا؟ (اصل حقائق، ص ۲۱)۔ اس ضمن میں "نسخۂ خواجہ" کے "حرفے چند" میں عرض کیا جا چکا ہے کہ :

> "اس بیش بہا خطی نسخے کا میرے ذخیرۂ غالبیات کا حصہ بننا جائے خود ایک خدا سازبات ہے۔ کتاب سے ربط ضبط اور شوق و شغف رکھنے والوں کو خوب معلوم ہے کہ نادر و نایاب کتابیں آئے دن ہاتھ نہیں آتیں اور یا پھر یک بارگی باران رحمت ہو جاتا ہے۔ یہ بس حسنِ اتفاق یا نصیب کا معاملہ ہے۔ ۱۹۸۱ء کے پس و پیش مجھے آگے پیچھے پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے تین نادر مطبوعہ کتابیں اور دو قیمتی مخطوطے ملے (ان میں ایک مخطوطہ دیوان غالب (اردو)، نسخۂ خواجہ ہے)——"
>
> (نسخۂ خواجہ، حرفے چند، ص ۴-۲)

ت۔ف کہتے ہیں :

> "پرانی کتابوں کا یہ کاروباری کون ہے؟ جب تک مُعین صاحب اس کی صراحت نہیں کرتے، دیوان غالب کے نسخۂ خواجہ کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار فطرتاً کیا جاتا رہے گا——"
>
> (اصل حقائق، ص ۲۱)

انار کلی لاہور، پرانی کتابوں کا چلتا پھرتا معروف مرکز ہے۔ اس کے اتوار اور جمعہ بازار ملک گیر شہرت رکھتے ہیں —— لاہور، اور لاہور سے باہر تک کے پرانی کتابوں کے عاشق، دور دراز سے ہفتے کے ہفتے یہاں کی یاترا کرتے ہیں اور فٹ پاتھ پر دور دور

تک پھیلے اور بکھرے کتابوں اور رسالوں وغیرہ کے ڈھیر سے اپنے مطلب، موضوع اور ضرورت و پسند کی چیزیں پانے کی کرید اور جستجو میں رہتے ہیں — جیلانی کامران نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ :

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سو سال بعد بہت سے ایسے نسخے لاہور کے فٹ پاتھوں پر بکتے ہوئے پائے گئے۔ یہ وہاں کیسے پہنچے ؟ کسی کو پتہ نہیں — "

میں نے برسوں اپنے شوق کی چیزوں کی تلاش میں چلتے پھرتے پرانی کتابوں کے ان ڈھیروں کی خاک چھانی ہے اور گوہر مراد پائے ہیں۔ "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" میری اسی خاک نوردی کا حاصل ہے۔ پرانی کتابوں کے قدر دان اس کی تائید کریں گے کہ انھیں کیسی کیسی قدیم مطبوعہ یا خطی کتابیں تلاش و جستجو اور وقت گردی کی عادت اور ریاضت کے نتیجے میں ملیں۔

"نسخۂ خواجہ" پر ملکیت کے کوئی آثار نہیں تھے، لیکن کتنی ہی قیمتی چیزیں پرانی کتابوں کے کاروباریوں سے ایسی بھی ہاتھ آتی ہیں جن پر قدیم مالکوں/اداروں کے اسماء، مہریں یا اندراجات پائے جاتے ہیں، لیکن یہ امور، ان کی خرید میں مزاحم نہیں ہوتے — اور صاحبِ نظر کتاب دوست انھیں، پرانے مالکوں کے حوالوں کے جاننے کے باوجود بہ صرف زر کثیر خریدتے ہیں —

دیوانِ غالب (موسومہ "نسخۂ خواجہ") مجھے پرانی کتابوں کے کاروباری سے کتابوں کے ڈھیر میں فٹ پاتھ سے ملا تو اس پر کسی معروف یا معلوم مالک کا نام درج نہیں تھا — درج ہوتا بھی تو میں اسے حاصل کرنے میں دیر نہ کرتا — اس بارے میں میں نے "نسخۂ خواجہ" (مطبوعہ) میں لکھا ہے کہ اس کے :

"صفحہ ۱۲۷ کا نصف آخر، خوشنما، سنہری بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ اس کے وسط میں کاغذ کا ایک ان گھڑ ٹکڑا چسپاں ہے۔ کاغذ کا یہ قطعہ بظاہر مخطوطے کے کاغذ ہی کا ہم رنگ اور ہم عمر دکھائی دیتا ہے۔ اس پر نسبتاً جلی قلم سے غلط املا کے ساتھ "فتے دین" اور اس کے نیچے درست املا میں "فتح دین" درج ہے۔ قلم اور روشِ خط، مخطوطے کے کاتب سے مختلف ہے۔

"غالبیات" میں "فتح دین" نام کی کوئی شخصیت معلوم اور معروف نہیں، ممکن ہے یہ مخطوطہ کبھی کسی "فتح دین" نامی شخص کی ملکیت رہا ہو — یا اس "چپی" کے نیچے کوئی ایسا اندراج ہو، جسے چھپانے کے لیے بعد میں مصلحتاً کسی نے یہ کارروائی کی ہو۔ مخطوطے کے بعض دوسرے صفحات (صفحہ ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۶، ۲۸، ۸۲ اور صفحہ ۸۳) کے نیچے یا دائیں بائیں اطراف کی خالی جگہوں میں غالباً مرمت کی غرض سے پرانے دیسی بادامی دیمک زدہ کاغذ کے ٹکڑے چسپاں ہیں لیکن اس عمل سے مخطوطے کا متن بالکل محفوظ رہا ہے۔ پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے، یہ نسخہ میرے پاس آیا تو آخری صفحے کی "چپی" میرے لیے الجھن کا باعث ہوئی، لیکن نایاب کتابیں آئے دن ہاتھ نہیں آتیں۔ ان کی ملکیت کے بارے میں زیادہ حساس ہونے کے نتیجے میں قیمتی متاع ہاتھ سے نکل جائے تو پھر عمر بھر کا پچھتاوہ رہ جاتا ہے۔ یہ نسخہ برسوں سے میرے ذخیرے میں ہے۔ عہدِ

غالب تک درجہ بدرجہ اس کی ملکیت کے منازل متعین اور طے کرنا مشکل ہے اور یہ ضروری بھی نہیں۔ یہ، بہر حال طے ہے کہ غالب کے اردو دیوان کا یہ نادر و بیش قیمت نسخہ، جو کبھی خود غالب کی ملک رہا ہے، ۱۸۵۷ء کی غارت گری کی باقیات میں سے ہے۔ یہ کیسی خوش قسمتی ہے کہ یہ چار ہاتھوں سے بالآخر مجھ تک پہنچا، اور حاضر عکسی اشاعت کے باعث اس نے از سرِ نو زندگی پائی۔ (ص ۳۳۸)

(۸)

میرا کوئی دعویٰ امتیاز، اس قیمتی قلمی نسخے کے حامل ہونے کا نہیں۔ میری حیثیت مالک کی نہیں، اس کے امین اور محافظ کی سی ہے۔ میرے لیے اگر کوئی وجہ امتیاز یا دلیلِ افتخار ہو سکتی ہے تو وہ اس گم گشتہ دولتِ بے بہا کی بازیافت اور اس کی تدوین و ترتیب میں مضمر ہے۔ میں اسے خوش قسمتی جانتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری کی باقیات میں سے یہ نسخہ بچ رہا اور بالآخر مجھ تک پہنچا اور حاضر عکسی اشاعت (۱۹۹۸ء) کے باعث اس نادر و نایاب منفرد اور منقش نسخے نے از سرِ نو زندگی پائی — اور میں اسے دور و نزدیک کے غالب دوستوں تک پہنچا سکا۔

اس حوالے سے میری کامیاب سعی کی تحسین بھی ہوئی ہے۔[۲] رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"... اس نسخے کی نگہداشت، ترتیب اور طباعت میں جس قدر کاوش آپ (معین صاحب) نے کی ہے، اس کا معترف ہوں۔

آپ کے حسنِ نظر کی داد دیتا ہوں اور اہتمامِ طباعت کی (بھی) ہے۔ مُعین صاحب نے جس تعلقِ خاطر کے ساتھ اس نسخے کو احتیاط سے رکھا اور پھر جس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے چھاپا، یہ دونوں باتیں داد طلب ہیں۔ یہ نسخہ مُعین الرحمٰن صاحب کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ ان کا توسط یوں بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح وہ محفوظ رہا۔ ورنہ معلوم نہیں آج وہ کہاں ہوتا۔ نسخۂ امروہہ یا نسخۂ بھوپالی کا حشر ہم سب کے سامنے ہے۔"

شعبۂ اردو، ہندو یونیورسٹی بنارس کے صدر اور پروفیسر، ڈاکٹر حنیف نقوی کا کہنا ہے کہ :

"نسخۂ خواجہ" ایک تحفہ ہے۔ کلامِ غالب کی تحقیق و تدوین سے دل چسپی رکھنے والے اس گوہرِ نایاب تک رسائی کے لیے ہمیشہ ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن کے ممنونِ کرم رہیں گے۔ اس قسم کے نادر و نفیس مخطوطے کی اشاعت کی بہترین صورت وہی ہو سکتی ہے جو مُعین صاحب نے اختیار کی۔"

(دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، ص ٧٣)

شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر نیر مسعود کا ارشاد ہے کہ :

"نسخۂ خواجہ" : مطالعاتِ غالب کی ایک ضروری کڑی ہے۔ ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے اس انعام کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے بجائے، اسے شائع کر کے ہم سب کو اس کا حصے دار بنا دیا اور اردو دنیا کو غالب کے دو صد سالہ جشنِ ولادت کا بہترین تحفہ عطا کیا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے دیوانِ غالب کے اُن اہتمامی مخطوطوں کی نشاندہی کی ہے، جو، اب مفقود الخبر ہیں۔ خوش قسمتی سے "نسخۂ خواجہ" والا مخطوطہ محفوظ رہ گیا بحہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک شیفتۂ غالب کے محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے متنی تنقید و تحقیق کے ساتھ اس مخطوطے کی تدوین اسی شان کے ساتھ کی ہے جو ایسی اہم دریافت کے شایان ہے۔"

(ایضاً، ص ۴۹، ۵۰)

ڈاکٹر سلیم اختر شاہد ہیں کہ :

"ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس قابلِ رشک لائبریری کے ساتھ نادر کتب نایاب ایڈیشنوں اور مخطوطات پر مشتمل ذخیرہ نوادر بھی ہے۔ کیوں کہ وہ ایسی کتابوں اور مخطوطات کے قدر دان ہیں، اس لیے انہیں ایسی چیزیں مل بھی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں قیمت مسئلہ نہیں بنتی : خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس!"

(ایضاً، ص ۲۰۲)

ڈاکٹر توصیف تبسم فرماتے ہیں :

"یہ خطی نسخہ ڈاکٹر معین صاحب کے ذاتی کتب خانے میں تھا، جو اب ہر جویائے علم کی دسترس میں ہے...... ہمیں ڈاکٹر معین صاحب کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس خاص نسخے کی اشاعت کا اہتمام کر کے غالب شناسی کے دشوار مراحل کو پہلے سے آسان بنادیا—" (ایضاً، ص ۱۶۵ اور ص ۱۶۷)

ڈاکٹر نجم الاسلام لکھتے ہیں کہ :

''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا مرتبہ ''دیوانِ غالب'' خوب صورت تحفہ ہے۔ غالب و غالبیات سے معین الرحمٰن صاحب کی جو گہری وابستگی ہے اور قلبی تعلق ہے، وہ بھی خوبی ظاہر و باہر ہے۔ تعارفی تحریر میں کچھ احوال ان کے کتاب خانے کے نوادر کا بھی آگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نوادر صحیح جگہ پہنچ گئے ہیں۔ اور ''نسخۂ خواجہ'' کی تو قسمت ہی کھل گئی — معین صاحب اسے منظرِ عام سے لے آئے ہیں —'' (ایضاً، ص ۳۰۹)

مشفق خواجہ کے یہ کلمات تو میرے لیے سند اور توقیع کا حکم رکھتے ہیں کہ :

''معین الرحمٰن صاحب تک اس نادر نسخے کا پہنچنا بلا جواز نہیں ہے۔ طلب، صادق ہو تو گوہرِ مراد خود اس کا خواہاں ہوتا ہے کہ اپنے طلب گار تک پہنچے۔ معین صاحب نے یہ امانت جس خوب صورت انداز سے غالب دوستوں تک پہنچائی ہے، اس سے خود غالب کی روح خوش ہو گی۔ اس نسخے کو خواجہ منظور حسین مرحوم کے نام سے منسوب کرنا بھی اچھا لگا۔ خواجہ صاحب کو اس سے بہتر طریقے سے خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا جا سکتا — لوگ مرنے والوں کو بھلا دیتے ہیں، معین صاحب انہیں اس طرح یاد کرتے ہیں کہ وہ زندہ نظر آتے ہیں —''

(دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین، ایضاً، ص ۳۰۹)

ان بزرگوں اور دوسرے بہت سے اکابر کے برعکس ت۔ف نے ''نسخۂ

خواجہ "کی میری تدوین کو نا قابلِ فخر کارنامہ قرار دیا ہے — کوئی شخص کسی علمی یا تحقیقی کارنامے یا فن پارۂ ادب کے بارے میں اپنی توفیق اور بساط کے مطابق ہی رائے دینے یا قائم کرنے کا مکلّف ہو سکتا ہے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ یہ معذوری اور مجبوری سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن خواجہ منظور حسین مرحوم سے میرا جو رشتہ اور تعلقِ خاطر ہے[۶]، اسے جاننے کے باوجود لیکن اس کا کچھ لحاظ رکھے بغیر، دیوان غالب کے اس نسخے کو خواجہ منظور حسین سے منسوب کرنے کے میرے حد درجہ پرسَل اور احترام آمیز جذبۂ محبت پر بھی چھینٹے اڑائے گئے ہیں۔ (ص ۵۹)۔

ت۔ف کا یہ طرزِ اظہار زہر میں بجھے تیر کی طرح دل میں ترازو ہو جانے اور گہرا گھاؤ دینے والا ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں، اس وقت سے کہ ت۔ف کو اپنی اولاد یا اخلاف سے اپنے یا اپنے بزرگوں کے بارے میں کبھی کچھ ایسا سننا پڑے۔

(۹)

ت۔ف کا کہنا یہ ہے کہ:

> "دیوانِ غالب کے (ایک) نادر قلمی نسخے پر سید عبداللہ کے مرقومہ تعارف نامے کے چار برس بعد قاضی عبدالودود نے — پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اسی نسخے پر شذرہ لکھا۔"
>
> (اصل حقائق، ص ۴)

ت۔ف کا یہ اصرار کہ قاضی صاحب کا شذرہ "اسی نسخے" پر لکھا گیا، بے دلیل اور نادرست ہے۔

ت۔ف کہتے ہیں :

"دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" کے ضمن میں میری (اور پاک و ہند کے کئی اہلِ علم کی) رائے یہ ہے کہ یہ نسخہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود کے متعارفہ "نسخۂ لاہور" سے الگ کوئی نسخہ نہیں، عین مین وہی نسخہ ہے —"

(اصل حقائق، ص ۱۰)

"کئی اہلِ علم" کی رائے سر آنکھوں پر، لیکن تقابلی مطالعے سے اگر ان نسخوں میں فرق دکھائی دیتا ہے تو ان کا "عین مین" ایک ہی نسخہ ہونا کیوں کر باور کیا جاسکتا ہے! ت۔ف لکھتے ہیں کہ :

"میں نے دیوانِ غالب کے نسخۂ خواجہ کے باب میں متعدد اہلِ نظر سے تبادلۂ خیالات کیا (ان حضرات کے اسماء کا ذکر سرِ دست مناسب نہیں سمجھا گیا)، سب کی متفقہ رائے تھی کہ نسخۂ خواجہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ہی کے گم شدہ نسخے کا ظہورِ ثانی ہے۔ سب کی یہی رائے تھی کہ نسخۂ خواجہ، سید عبداللہ کے متعارفہ نسخے میں مبیّنہ فرق کی بنا پر، اس سے الگ نسخہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ فرق محض اس لیے نظر آتا ہے کہ سید عبداللہ سے اس نادر نسخے کے اشعار کی گنتی میں غلطی ہوئی —"

(اصل حقائق، ص ۲۲)

"متعدد اہلِ نظر کی متفقہ رائے" کا احترام اپنی جگہ — بایں ہمہ یہ کہنا کہ نسخۂ خواجہ اور سید عبداللہ کے متعارفہ نسخے میں فرق موجود ہے اور یہ فرق محض تعدادِ اشعار

کا ہے، "پوراسچ" نہیں ہے۔ حقیقتاً یہ فرق محض تعداد ہی کا نہیں۔ یہ فرق ان نسخوں میں موجود غزلوں کی کمی بیشی کا بھی ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے میں "نسخۂ خواجہ" کے مقابلے میں بیس اشعار زیادہ ہیں۔ بیس اشعار کا یہ فرق دونوں نسخوں میں شامل غزل کے اشعار میں ہے۔ سیّد عبداللہ نے اپنے پیشِ نظر نسخے میں ۱۳۳۲ اشعار غزل کے بتائے ہیں۔ "نسخۂ خواجہ" میں غزل کے اشعار کی تعداد ۱۳۱۲ ہے۔ "نسخۂ خواجہ" میں کچھ غزلیں گویا کم ہیں لیکن "نسخۂ خواجہ" میں کچھ غزلیں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے سے زیادہ بھی ہیں۔ تیرہ اشعار پر مشتمل یہ دو غزلیں "نسخۂ خواجہ" میں موجود ہیں:

۱۔ دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا

۲۔ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور

لیکن ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے سے یہ دونوں غزلیں خارج ہیں۔
(نسخۂ خواجہ، ص ۳۶)

اوپر کی جن غزلوں کے بارے میں سیّد عبداللہ نے شہادت دی ہے کہ وہ ان کے متعارفہ نسخے میں موجود نہیں، وہ دونوں غزلیں عرشی صاحب کے متعارفہ "نسخۂ لاہور" میں شامل ہیں جب کہ قاضی عبدالودود کی تصریحات اس بارے میں مجہول ہیں۔(نسخۂ خواجہ، ص ۳۷)

اس صورتِ حال میں ت۔ف اور ان کے متعدد اہلِ نظر ہم آواز اصحاب کی رائے سے کیوں کر اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ فرق، اشعار کی غلط گنتی کا ہے، ورنہ "نسخۂ خواجہ" اور سیّد عبداللہ کا متعارفہ نسخہ من و عن ایک ہے ——

ت۔ف اور ان کے ہم نواؤں کا یہ اصرار کہ سیّد عبداللہ، عرشی (قاضی

عبدالودود)اور نسخۂ خواجہ الگ الگ نسخے نہیں — ، میرے نزدیک محض اس مفروضے کو بہ حد یقین دل میں جگہ دے لینے کا نتیجہ ہے کہ "نسخۂ لاہور" بس ایک ہی تھا اور وہی تھا جس کا ذکر عرشی صاحب کرتے ہیں —

میرا احساس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں اردو دیوان غالب کے دو خطی نسخے رہے ہیں (یہ اب، دونوں موجود نہیں، یا لائبریری میں بے جگہ ہونے کے باعث دستیاب نہیں) — ایک وہ جسے قاضی عبدالودود نے دیکھا اور جسے عرشی صاحب نے "نسخۂ لاہور" بتایا — اس سے مختلف، دوسرا نسخہ وہ تھا، جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے متعارف کرایا —

ت۔ف کہتے ہیں کہ "نسخۂ خواجہ" کے مرتب .

"سید معین الرحمٰن اس بات کو ماننے پر آمادہ نظر نہیں آتے کہ اشعار شماری میں سید عبداللہ سے غلطی ہو سکتی ہے —"

(اصل حقائق، ص ۱۶)

ت۔ف مزید لکھتے ہیں کہ :

"سید معین الرحمٰن، سید عبداللہ کے سہو کو تو ماننے پر تیار نہیں، مگر بعض دیگر حضرات کی اشعار شماریوں کی غلطیوں کی وہ خود ایک سے زیادہ مقامات پر نشاندہی کر چکے ہیں — مثلاً امتیاز علی عرشی، سید اسد علی انوری اور مالک رام — اگر عرشی اور مالک رام کے پائے کے لوگ گنتی میں غلطی کر سکتے ہیں تو سید عبداللہ سے غلطی کیوں نہیں ہو سکتی —" (اصل حقائق، ص ۱۸)

میں نے اکابر سے سرزد ہو جانے والے کسی سہو کی کبھی قیاسی نشاندہی نہیں کی — جن مآخذ یا نسخوں کے کوائف بعض ثقہ بزرگوں نے پیش کیے۔ ان مآخذ تک

میری براہِ راست رسائی رہی تو ہی میں شماریاتی سہو یا صحت کی، اعتماد کے ساتھ تصدیق یا نشاندہی کر سکا۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے جس نسخے کو متعارف کرایا، وہ صرف انھی نے دیکھا، میری دسترس میں نہیں رہا — میں امکانِ سہو کی بات تو کر سکتا ہوں لیکن اپنے آپ کو اس کی تصدیقِ واقعی کی پوزیشن میں نہیں پاتا — شمار (گنتی) کی غلطی کا امکان اپنی جگہ لیکن وہ دوسرے بہت سے نمایاں فرق جن کی شہادت سیّد عبداللہ نے دی ہے۔ انھیں کیوں کر زیروزبر کیا جا سکتا ہے —

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا متعارفہ نسخہ، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا، "نسخۂ خواجہ" سے صرف تعدادِ اشعار کی بنا پر ہی مختلف نہیں (اشعار شماری میں غلطی ممکن ہے)، اس کی دوسری نمایاں وجوہ اور شہادتیں بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے متعارفہ نسخے میں اشعار کی تعداد کو ان کا سہو سمجھ کر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس کا جواب کیا ہو گا کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اپنے نسخے میں دو غزلوں:

۱۔ دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا

۲۔ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور

کے بارے میں بتاتے ہیں کہ موجود نہیں جبکہ یہ دونوں غزلیں "نسخۂ خواجہ" میں موجود ہیں، ان دونوں غزلوں کے بارے میں عرشی صاحب کا مشاہدہ اس کے برعکس ہے۔ وہ ان دونوں غزلوں کو "نسخۂ لاہور" میں شامل مانتے ہیں —

ڈاکٹر حنیف نقوی کہتے ہیں کہ "قوی امکان ہے کہ ان دونوں مقامات پر ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے چوک ہو گئی ہوگی"۔ ت۔ ف نے بھی نقوی صاحب کا حوالہ دیا ہے۔

(اصل حقائق، ص ۱۵)

میرے نزدیک ڈاکٹر حنیف نقوی کے اس "قیاس" کو "بمنزلہ" حقیقت قرار دینا مشکل ہے — خاص طور پر اس صورتِ حال میں کہ سید عبداللہ نے جس قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے، وہ اب دستیاب نہیں، — ایک ناموجود نسخے کے بارے میں، اس نسخے کو نہ دیکھنے والے (حنیف نقوی) کا قیاس، اس نسخے کے ایک معتبر عینی شاہد (سید عبداللہ) کی گواہی پر کیوں کر راجح مانا جاسکتا ہے؟

میں "نسخۂ خواجہ" کو ڈاکٹر سید عبداللہ کے متعارفہ نسخے کا ہم عصر اور مماثل مانتا ہوں لیکن ان میں فرق اور اختلاف بھی بہت نمایاں ہے۔

موجود شہادتوں کی روشنی میں مولانا عرشی اور قاضی عبدالودود کا متعارفہ قلمی نسخہ جسے عرشی صاحب "نسخۂ لاہور" کہتے ہیں، "نسخۂ خواجہ" سے نسبتاً زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن انھیں من و عن ایک کہنا یا سمجھنا قرینِ حقیقت نہیں۔ خیال ہے کہ انؐ دونوں نسخوں کی "اصل" کوئی ایک ہی مسودہ رہا ہو، جس سے ایک ہی کاتب نے ایک ساتھ دو یا زیادہ نقلیں تیار کی ہوں^۸ — اس لیے دونوں میں بہت سی غلطیاں مشترک ہیں اور یہ کہ یہ کتابت شدہ قلمی نسخے ہیں (مطبوعہ نہیں)، ان میں کہیں کہیں باہم فرق بھی ہو گیا ہے، جسے بشری اور فطری سہو خیال کرنا چاہیے —

(۱۰)

ت۔ف کے کتابچے کے آخر میں مختلف نسخوں کے کچھ صفحات کی عکسی نقول دی گئی ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے کسی غیر معمولی تکنیکی ماہر کی معاونت ضروری ۔ کہا گیا ہے کہ نسخۂ متعارفہ عرشی کے آخری صفحے کے عکس

میں کوئی "مدّور مہر" نظر آ رہی ہے۔ "نسخۂ خواجہ" کے آخری صفحے کے عکس میں یہاں "فتح دین / فتے دین" کی چٹی لگی ہے۔[۹] یہ ایک اچھی پیش رفت ہے۔—

"نسخۂ خواجہ" کے متعدد دوسرے صفحات (۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۸، ۸۲ اور ۸۳) کے نیچے یا دائیں بائیں، اطراف کی خالی جگہوں پر مرمت (؟) کی غرض سے چسپاں کاغذی ٹکڑوں / تراشوں کا میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ (دیکھئے نسخۂ خواجہ، ص ۳۳۸)— ان مقامات پر یا نسخۂ متعارفہ عرشی کی نقل میں کہیں اور، نسخے کی ملکیت کے کوئی آثار ہاتھ آ جائیں تو صورتِ حال اور "نسخۂ خواجہ" کے قدیم مالک شخص یا ادارے کے بارے میں بالیقین کچھ کہنا ممکن ہو سکے گا۔—

اس ضمن میں ایک اور علمی تقابل بھی نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ "نسخۂ خواجہ" کے صفحہ گیارہ پر چھٹا مصرع اس طرح ضبط ہوا ہے: جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

"نسخۂ لاہور" میں عرشی صاحب کی شہادت کے مطابق مصرعے کی صورت یہ ہے: جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہوگا۔ جب کہ صحیح ردیف "ہونا" ہے—، "ہوگا" نہیں۔

رامپور میں موجود عکسی نقل کے اس مقام کو دیکھ لیا جائے کہ یہاں صورت، عرشی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ہے یا ان سے چوک ہوئی؟— اگر عکس کی شہادت عرشی صاحب کے مشاہدے کی تائید نہ کرے تو گویا پھر "نسخۂ خواجہ" کے عین مین "نسخۂ لاہور" ہونے کے بارے میں بظاہر کوئی اشتباہ نہیں رہ جائے گا۔—

میرے لیے رامپور سے نسخۂ متعارفۂ عرشی کی عکسی نقل منگانا ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا۔ یہ مکمل عکس فراہم نہ ہونے تک مذکورہ بالا مقامات کی، بھارت کے کسی صاحبِ نظر محقق کی جانب سے تصدیقی شہادت ہی میسر آ جائے تو مغالطے ختم ہو سکیں گے۔

(۱۱)

"نسخۂ خواجہ" کے الگ وجود کو منانے یا منوانے پر میرا اصرار کبھی نہیں رہا — میں نے تو وقتِ نظر کے ساتھ اس کے مطالعے، مشاہدے، تقابل اور تجزیے سے کسی آزادانہ نتیجے پر پہنچنے کی اپنی سی بے حد مخلصانہ کوشش کی ہے۔ میری اس غیر جانبدارانہ کوشش کا نوٹس بھی لیا گیا ہے — نذیر احمد صاحب جو قدیم مخطوطات اور دستاویزات کے علوم پر گہری نظر رکھنے کے امتیاز کے حامل ہیں، لکھتے ہیں کہ:

"سیّد مُعین الرحمٰن نے نسخۂ خواجہ اور بعض دوسرے نسخوں میں مماثلتیں بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں، اس حد تک کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید "نسخۂ خواجہ" وہی نسخہ ہے جس کا تعارف سیّد عبداللہ کروا چکے ہیں اور جو اب پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطات کے خزانے سے معدوم ہے — یا شاید یہ وہی خطی نسخہ ہے جس کا معائنہ کتب خانہ یا دانش گاہِ پنجاب میں قاضی عبدالودود ۱۹۵۷ء میں کر چکے ہیں — مگر پھر ڈھیرے ڈھیرے سیّد مُعین الرحمٰن عصری شہادتیں جمع کرتے ہیں اور "نسخۂ خواجہ" کے متن کے غائر مطالعے کے ذریعے اس اختلاف پر روشنی ڈالتے ہیں جس کی بنا پر "نسخۂ خواجہ" کی انفرادیت قائم ہو جاتی ہے —"

"سیّد مُعین الرحمٰن کی متنی تنقید و تحقیق کی غالباً سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پورے ادبی تناظر کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ

کرتے ہیں۔ اپنے پیش رووں کے کام کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں اور بڑے سلیقے سے ان نکات کو ابھارتے ہیں جو ان کی اپنی تحقیق کا حاصل ہیں طرزِ استدلال منطقی ہے۔ نثر میں سادگی، صراحت اور قطعیت ہے ... دستاویزی شہادتوں کو اولیت حاصل ہے۔ ان مستحکم بنیادوں پر جو تحقیق انھوں نے استوار کی ہے، وہ قابلِ قدر اور پائیدار ہے —" (دیوان غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۲)

صاحبِ دیدہ و دانش اشفاق احمد صاحب نے "نسخۂ خواجہ" کے مرتب کی وضعِ تحقیق کا اپنے مخصوص اسلوب میں تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو تحقیق و تفتیش کے میدان میں ایک خصوصی حس ودیعت ہوئی ہے — پہلے تو وہ اپنے عمومی مشاہدے اور انصرامی تجربے کے زور پر ایک مسئلے کا احاطہ کرتے ہیں — پھر، انتقاد کے طے شدہ اصولوں کے مطابق اندک اندک اس کی گرہ کشائی کرتے چلے جاتے ہیں — آخر میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں، جو ابتدا میں تو اندازہ تھا، لیکن بعد میں کاملاً اور عیناً درست ثابت ہوا —" (دیوان غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۰)

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے "نسخۂ خواجہ" کے مرتب کی روشِ تحقیق کا تجزیہ اور محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ڈاکٹر (معین) صاحب نے اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے اس کی خصوصیات اور کیفیات کو ان کی جزئیات کے ساتھ ایسی

غیر جانبداری اور اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ بیان میں کہیں سقم نظر نہیں آتا۔ انہوں نے ایسے مقامات پر رائے خود قائم نہیں کی ہے اور نہ ہی اپنی رائے قارئین پر مسلط کی ہے — بلکہ انہیں خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا ہے۔ یہی ان کی دیانت کا ایک کھلا اظہار ہے۔ اس مقام پر ڈاکٹر صاحب نے اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے کلامِ غالب کے اب تک کے دستیاب قلمی نسخوں کا ایک تاریخی جائزہ بھی لیا ہے اور ان کی تقابلی خصوصیات وکیفیات بھی ملحوظ رکھی ہیں۔

یہ نسخہ انہیں لاہور میں ایک کتاب فروش سے دستیاب ہوا۔ "دیوان غالب" کے قبل ازیں لاہور میں موجود تین قلمی نسخوں کا وجود مسلّمہ ہے۔ ان میں سے کم از کم دو متعارفہ نسخے قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے چشم خود مشاہدے اور مطالعے کے بعد متعارف کرائے تھے۔ جب کہ "نسخۂ لاہور" متعارفہ امتیاز علی خاں عرشی بھی چشم دید کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسے قاضی عبدالودود نے ملاحظہ کیا تھا اور اس کی خصوصیات و کیفیات سے عرشی صاحب کو مطلع کیا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں نسخے، جن کی مشترک و منفرد خصوصیات کی تفصیلات ڈاکٹر معین الرحمن صاحب نے مذکورہ اکابر کے بیانات کی روشنی میں یکجا کر دی ہیں، اب اپنے مقام پر موجود نہیں یا اب دستیاب نہیں!

...... لاہور کے مذکورہ تینوں نسخوں کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی میں "نسخۂ خواجہ" ہی اب واحد نسخۂ لاہور کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ لیکن اس میں ایک ہی کاتب کا قلم استعمال ہونے کے باوصف یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ مذکورہ نسخوں میں سے کوئی

ایک نسخہ نہیں — ایک الگ اور مختلف نسخہ ہی ہے۔ کیوں کہ خاصی مماثلتوں کے باوجود "نسخۂ خواجہ" میں، مذکورہ تینوں نسخوں کے مقابلے میں قدرے فرق بھی موجود ہے اور اس نسخے میں قلم بھی ایک ہی استعمال ہوا ہے۔ ورنہ اس نسخے میں اگر قلم مختلف ہوتے، اور خصوصاً اختلافِ نسخ میں مختلف قلم استعمال ہوتا تو اشعار یا غزلوں کی کمی بیشی کے باعث، جن کی تفصیلات ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے درج کر دی ہیں، کوئی شبہ کیا جا سکتا تھا۔ اگر کسی نے سابقہ مذکورہ نسخوں میں سے کسی ایک نسخے کو "نسخۂ خواجہ" کی صورت میں، متن میں موجودہ اختلافات پیدا کر کے پیش کر دیا ہوتا تو اس میں موجود اضافے کسی اور قلم سے ہوتے اور جو اشعار یا غزلیں نسبتاً یا مقابلۃً کم ہیں، ان کا کوئی نہ کوئی نشان موجود ہوتا یا کسی نہ کسی طرح کا ثبوت مل جاتا۔

اپنے نتائج کے اخذ کرنے میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کی تحقیقی دیانت بھی دیدنی ہے۔ انھوں نے جہاں مخطوطے کے زمانی تعین میں سنِ کتابت پر قیاس کیا ہے، وہیں شبہ بھی کیا ہے۔ کوئی امر انھوں نے ایسے طے نہیں کر لیا تھا کہ جسے وہ ثابت کرنا ضروری سمجھتے اور اس پر اصرار محض کرتے۔ یا اپنے نسخے کو یکسر مختلف اور الگ ثابت کرنے کے لیے دیگر نسخوں کی دستیاب شہادتوں کو نظر انداز یا کمزور ثابت کرتے۔ انھوں نے ایسا کوئی رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ املائی خصوصیات، اشعار کی کمی بیشی اور دیگر تمام خصوصیات کو بعینہٖ اس طرح بیان کر دیا ہے کہ "نسخۂ خواجہ" از خود ایک مختلف اور منفرد نسخہ قرار پاتا ہے۔"

(۱۲)

میں "نسخۂ خواجہ" کو اپنے ذخیرے کی بڑی قیمتی متاع خیال کرتا ہوں اور اسے مطالعۂ غالب کی پوری تاریخ میں ایک بہت اہم دستاویز جانتا ہوں — یہ اتنی بڑی علمی اور ادبی میراث اور امانت ہے کہ اس کا کسی "شخصی" ذخیرے میں ہونا یا رہنا، اس کا صحیح مصرف نہیں — کوئی شخص وہ غالب اور غالبیات کا کیسا ہی ماہر یا عاشق کیوں نہ ہو، انفرادی حیثیت میں اس کی کب تک خاطر خواہ حد تک حفاظت کر سکتا ہے۔

مجھے اطمینان ہے اور یہ امر میرے لیے وجۂ امتنان بھی ہے کہ یہ قیمتی نسخہ میں محفوظ کر سکا۔ ہمارے ادب کے بہت سے پچھلے حادثوں کی طرح، یہ غتر بود یا ضائع ہو جاتا ہے تو یہ کیسی سنگین محرومی اور تہی مائیگی ہوتی — میں برسوں سے یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ "دیوان غالب" (نسخۂ خواجہ) کا اصل خطی نسخہ عام استفادے اور حفاظت، ہر دو کے حوالے سے کسی مرکزی جگہ رکھا جانا چاہیے۔ "نسخۂ خواجہ" کے مطابق اصل، ڈی لکس رنگین ایڈیشن کی تیاری میرے پیش نظر ہے۔ امید ہے یہ کام اسی برس صورت پذیر ہو کر اہلِ علم کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

۷ راگست ۱۹۹۹ء کو میں نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر (جناب ڈاکٹر خالد حمید شیخ) کی خدمت میں لکھا تھا کہ

"... پنجاب یونیورسٹی کے مجھ پر کچھ حقوق معرفت ہیں۔ غالب پر چھپتے، لکھتے، پڑھتے اور پڑھاتے تیس برس سے زیادہ ہو چلے۔ ملک میں اور بیرون ملک، غالب پر میری علمی فتوحات کی قدر

افزائی ہوئی ہے، لیکن یہ بات میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ
غالب پر میری پہلی کتاب ۱۹۶۹ء میں "اشاریۂ غالب" کے نام
سے پنجاب یونیورسٹی، لاہور ہی کے زیرِ اہتمام چھپی، یہ وہ نشان
منزل ہے جو غالب سے پھر، میری عمر بھر کی وابستگی کا باعث
بنا—— ۶۶-۱۹۶۵ء میں مجھے شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی
اورینٹل کالج میں بطور لیکچرار کام کرنے کی عزت بھی حاصل
ہوئی......

......میرا شخصی ذخیرۂ غالبیات خاصا مضبوط ہے، لیکن
"نسخۂ خواجہ" اتنا نادر اور اہم ہے کہ اسے شخصی ذخیرے میں
ہونے کے بجائے، استفادۂ عام کے لیے کسی علمی ادارے یا
میوزیم میں ہونا اور رکھا جانا چاہیے۔

میں "دیوانِ غالب اردو، نسخۂ خواجہ" کے ڈی لکس
ایڈیشن کی فکر اور تیاری میں ہوں۔ اس کام سے فراغت پالینے کے
بعد، پنجاب یونیورسٹی سے اپنے دیرینہ تعلق کی بنا پر، میری خواہش
ہے کہ "نسخۂ خواجہ" (خطی) کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں رکھ دیا
جائے—— اس "ذرا سی" شرط کے ساتھ اور یہ "ضمانت" حاصل
کرنے کے بعد کہ بطور سربراہِ جامعہ، اس کی حفاظت کا آپ، کوئی
ایسا مستقل انتظام فرما سکیں کہ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور
میں دستیاب رہے اور پچھلے نسخوں کی طرح معدوم یا ضائع نہ ہو
جائے۔

......"دیوان غالب نسخۂ خواجہ" غالب کا نظر یافتہ اور زر نگار اصلاحی مخطوطہ ہے رائج الوقت سکے میں اس کی قیمت لگائی یا چکائی ہی نہیں جاسکتی۔ میں آپ کی اجازت سے اس بے مثال قیمتی نسخے کو بلا قیمت، عطیہ ٔ اعزازی کے طور پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کو پیش کرنے کی خوشی پاؤں تو یہ امر، میرے لیے طمانیت اور سعادت کا باعث ہوگا۔ اپنی اس پیش کش پر آپ کے ردِّ عمل کا منتظر رہوں گا......"

مجھے اپنی اس مخلصانہ پیش کش کا کوئی جواب نہیں ملا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں اس اصل خطی نسخے کو محفوظ کرادینا قابلِ عمل نہ ہوا تو بلا کسی قیمت، بطور ہدیہ دار مغان اس قیمتی متاع کو لاہور میوزیم میں رکھوا دینا میری دوسری ترجیح ہوگی --- میرے ایک کرم فرمانے اسے نیشنل لائبریری آف پاکستان، اسلام آباد میں جمع کرادینے کا مشورہ بھی دیا ہے۔

o o

وضاحتی ضمیمہ (کچھ دوسرے اتہامات کے رد میں) :

ت۔ف نے "نسخۂ خواجہ" کے اصل خطی متن میں امکانِ تحریف کا شقلہ چھوڑا ہے۔ اپنے اس گمان فاسد کو "قابلِ قبول" بنانے اور اپنے تئیں مشاعرہ لوٹنے کے لیے انہوں نے تین ناگوار اور بے بنیاد امور کو مجھ سے منسوب کیا ہے :

- رشید احمد صدیقی کے ساتھ تصویر کا قصہ
- ادا جعفری پر اپنی ایک شاگرد کے تھیسس کو اپنے نام سے چھپوانے کا اہتمام
- "جاگیرِ غالب" کو اپنے نام سے چھپوانے کی بات

(۱)

پہلے قصے کا تعلق رائے قائم کرنے والے کی سخن فہمی سے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی جس طرز اور مزاج کی کتاب تھی اور جس روش سے میں نے اسے ریزہ ریزہ ترتیب و تشکیل دیا تھا، اس کی مناسبت سے میں نے رشید صاحب کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی — اس پر مجھے قریب اور دور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داد ملی۔ اپنی کتاب "شخصیات اور ادبیات" (مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۵ء) میں، یہ بات میں لکھ بھی چکا — شئے لطیف سے خالی اور خوش ذوقی سے رشتۂ عناد رکھنے والے کوئی صاحب اسے کس طرح دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس پر کچھ کہنا امر زائد ہوگا!

"عالم فاضل" ہونے اور "عقل سے پیدل" ہونے میں بُعد یا بیَر کا رشتہ نہیں۔ کسی شخص کا منوں ٹنوں کے حساب سے پڑھا لکھا ہونا، اس امر کی لازمی ضمانت نہیں کہ وہ بنیادی سمجھ یا کامن سینس بھی رکھتا ہو —

(۲)

دوسری بات ت۔ف نے یہ لکھی ہے کہ میں نے :

"—اپنی ایم۔اے اردو کی شاگرد بشریٰ باسط کے مقالے : "ادا جعفری— شخصیت اور شاعری" (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصہ اپنے نام سے نقوش میں چھپوادیا—(یہ) المیہ ہے۔"

(اصل حقائق، ص ۲۱)

یہاں مجھے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب کی بات کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ "واقعی انسان آخرت کی زندگی سے بے نیاز ہو جائے تو کچھ بھی کہہ سکتا ہے—"

ادا جعفری کی شخصیت اور شاعری پر عزیزہ بشریٰ باسط کے تھیسس کا معاملہ ایک خاص پس منظر رکھتا ہے، جس کا تذکرہ یا چرچا میرے لیے ایک امرِ ناخوشگوار ہے۔ لیکن ت۔ف کے اتہام کی وضاحت میں مجھے یہ ناگوار تفصیل ریکارڈ پر لانا پڑ رہی ہے۔

بشریٰ باسط کے والد پہلے سے امریکہ میں تھے—ان کی والدہ کو اپنے پیچیدہ علاج کے سلسلے میں بیٹی کو گورنمنٹ کالج، لاہور کے گرلز ہاسٹل میں چھوڑ کر امریکہ جانا پڑا۔ یہ بیماری طوالت پکڑ گئی اور اندیشہ ناک ہوتی چلی گئی—تاآنکہ خود بشریٰ باسط کا امریکہ جانا ناگزیر ہو گیا۔ والدہ کی علالت اور ویزے وغیرہ کے معاملات اور مشکلات کے باعث وہ تھیسس کی ترتیب و تالیف کے ایام میں یکسو نہ رہ سکیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر ان

کے مقالے کے نگران تھے۔ انھوں نے کام کی رفتار اور اس کے معیار کی جانب سے بے اطمینانی ظاہر کی۔ مجبوراً بالکل آخری ہفتوں میں کام کی نگرانی کی ذمہ داری مجھے اپنے سر لینا پڑی۔۔۔ تھیسس کے "حرفے چند" میں میں نے لکھا ہے کہ :

".....ادا جعفری کی شخصیت اور شاعری پر یہ مقالہ نشیب و فراز اور امید و بیم کی نت نئی منزلوں اور اوگھٹ گھاٹیوں سے گزر کر صورتِ اتمام کو پہنچا ہے۔ میرے لیے آزمائش کا مشکل ترمرحلہ وہ ثابت ہوا جب دسمبر ۱۹۹۰ء میں ایک روز خاموشی سے ڈاکٹر سلیم اختر نے مجھے بتایا کہ وہ رفتار اور روشِ کار سے بالکل مطمئن نہیں ہیں۔۔۔ مقالے کو دوسرے سالانہ امتحان تک کے لیے موخر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن مقالہ نگار کے خانگی حالات، اس کے متقاضی تھے کہ کام اسی برس ختم ہو۔۔۔ اس موضوع پر کام کرانے کی منظوری حاصل کرنے میں میرے اشتیاق اور میری کوشش کو دخل تھا۔ اسے ناتمام چھوڑ دینا یا التوا میں ڈال دینا مجھے گوارا نہ ہوا۔۔۔ اور جب کہ، مہلتِ کار قریب قریب ختم ہو گئی تھی، کام کرانے کا بار خود مجھے اٹھانا پڑا۔۔۔"

(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۳۱؍جنوری ۱۹۹۱ء)

تھیسس کی متعینہ وقت کے اندر رسمی تکمیل کے سلسلے میں بشریٰ باسط نے ادا جعفری کے بارے میں میری غیر مطبوعہ تحریروں سے بھرپور استفادہ کیا اور اپنے "پیش لفظ" میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ ان کے لفظ یہ ہیں :

"میرے لیے ادا جعفری پر مقالہ لکھنے کا مشکل اور دشوار مرحلہ

اپنے نگرانِ کار، استادِ محترم ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کی مدد کے بغیر، طے کرنا ممکن تھا۔ ان کی رہنمائی اور محنت کے نتیجے میں یہ مقالہ مکمل ہو سکا۔ مقالے کے چار حصے ہیں :

۱۔ تلاش اور جستجو (ص ۱۳—۵۹)
۲۔ حدیثِ ذات (ص ۶۰—۷۴)
۳۔ تحلیل اور تجزیہ (ص ۷۵—۱۶۱)
۴۔ تحقیق اور تلاش (ص ۱۶۲—۲۶۷)

ایک موقع پر ادا جعفری نے لکھا ہے کہ "مجھے تحقیق کا دعویٰ نہیں، نہ یہ میرا منصب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں دوسروں کی تلاش و جستجو کی صلاحیت ہی نہیں ہے — پھر یہ کام وقت کا ایثار چاہتا ہے۔ اس کے لیے بڑا علم چاہیے اور بے انتہا محنت —" ادا جعفری نے تو یہ بات ممکن ہے ازرہِ انکسار کہی ہو، لیکن ان کی یہ بات مجھ پر ضرور حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ — مقالے کے آغاز (ص ۱۳—۵۹) اور اختتام (ص ۱۶۲—۲۶۷) کے اجزا میرے لیے بمنزلہ "ارمغان اور عطیہ رحمٰن" ہیں۔ مقالے کے درمیانی حصے (ص ۶۰ — ۱۶۱) کی خوبی یا خستگی کے لیے میں جواب دہ ہوں —" (بشریٰ باسط، مقالہ : "ادا جعفری، شخصیت اور شاعری"، ص ۷-۸)

اس "پیش لفظ" میں انہوں نے بڑے سلیقے سے یہ اعتراف اور اظہار کیا ہے کہ تھیسس کے اوّل و آخر کے ابواب "عطیہ رحمٰن" (= مُعین الرحمٰن کی تحریروں پر مبنی

اور ان کی "محنت" کا حاصل) ہیں اور درمیانی ابواب خود مقالہ نگار کی کاوش کا نتیجہ ہیں—

ادا جعفری کے سلسلے کی میری یہی وہ تحقیقی مزاج کی تحریریں ہیں جن کے بارے میں سکینڈلائز کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ انہیں میں نے "نقوش" میں چھپوا لیا—

والدہ کی علالت اور لحہ بہ لحہ ان کی خستہ ہوتی ہوئی حالت کے پیش نظر، بشریٰ باسط کی جلد تر امریکہ روانگی کو ممکن بنانے کے لیے، میں نے (بطور صدر شعبہ)، دوسرے مقالہ نگاروں کے مقابلے میں ان کے زبانی امتحان (Viva Vo.ce) کو قبل از وقت کرانے کا اہتمام کیا اور وہ امریکہ سدھاریں۔

اس ساری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں، آخر کار وہ امریکہ پہنچ کر اپنی والدہ کو دیکھ سکیں۔ اگرچہ دو دن بعد ہی ان کی والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں — اپنے ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا کہ :

> "......والدہ کی اچانک وفات کا سانحہ، جسے ذہن نے آہستہ آہستہ اب قبول کر لیا ہے۔ گھر میں کم از کم اس طرح میں اس سانحے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ کہ اتنا عرصہ والدہ سے دور، ان کی صحت کے بارے میں اصل صورت حال سے پوری طرح واقف نہ ہو سکی اور کچھ تمام صورت حال کو مجھ سے مخفی رکھا گیا، جس کی وجہ، ان سے دور اور اکیلے ہونا تھا— اس لیے یہاں پہنچنے کے بعد ان کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ میری والدہ ہیں جو تین سال قبل تندرست حالت میں مجھ سے الگ ہوئی تھیں۔

جتنا کوئی انسان بیمار نظر آ سکتا ہے، وہ اتنی بیمار نظر آ رہی تھیں —— وہ واقعی اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی تھیں اور یوں لگتا ہے جیسے میرا ہی انتظار کر رہی تھیں کیوں کہ میں ابھی ان کی بیماری کی شدت کا ہی اندازہ کر رہی تھی کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئیں اور میں ان کے پاس صرف دو دن گزار سکی —— اور ان دونوں کی کیفیت بھی یوں تھی کہ لحہ بہ لحہ بیماری میں اضافہ ہو رہا تھا —— ان کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے اب، یہ اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ خدا نے ان پر مہربانی کی اور اس تکلیف سے انہیں نجات دی، جس کو وہ بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کر رہی تھیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ دُعاؤں میں ہمیں یاد رکھیں ——" (بشریٰ باسط، امریکہ، ۱۹۹۱ء)

بشریٰ باسط کے تھیسس کو وقت پر مکمل کرانے میں، مجھ پر بہت بوجھ اور دباؤ رہا لیکن اس تگ و تاز کا اطمینان بخش انسانی اور سماجی پہلو یہ ہے کہ وہ بالآخر امریکہ پہنچ کر اپنی والدہ کو جیتے جی دیکھ سکیں، اور پھر جیسا کہ اندیشہ تھا، وہ پاکستان لوٹ کر نہ آ سکیں۔ وہیں امریکہ / کینیڈا میں رہ بس گئیں —— اگر کسی نہ کسی طور ان کا تھیسس مکمل نہ ہو پاتا تو وہ ایم۔اے کے دوسرے سالانہ امتحان میں شرکت کے لیے پاکستان نہ آ پاتیں —— اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل میں، والدہ سے دور، تین برس کی طویل مدت گزارنے کے بعد اور باوجود، صرف بی۔اے کی بی۔اے رہ جاتیں ——

افسوس کہ ت۔ف کے اتہامی کلمات کے نتیجے میں مجھے بااکراہ اس معاملے کی جزئیات میں جانا پڑا۔

(۳)

آخری بات کا تعلق "جاگیر غالب" (پرتھوی چندر) کے بارے میں رسالہ "سورج" میں پیش کردہ ایک نقطۂ نظر سے ہے۔ اس کا جواب میں تفصیل سے "سورج" کے مدیر کے سپرد کر چکا۔

پرتھوی چندر کی کتاب "جاگیر غالب" ۱۹۷۰ء سے میرے ذخیرۂ غالبیات کا حصہ ہے۔ پچیس تیس برس سے میں مختلف مواقع پر اپنی تقریر اور تحریر میں اس نادر کتاب اور اس کے فاضل مولف پرتھوی چندر کا ذکر کرتا اور حوالہ دیتا چلا آیا ہوں[۱۲]— میں برسوں سے "جاگیر غالب" کی صاف ستھری اشاعت کا غالب دوستوں سے وعدہ کرتا چلا آرہا تھا[۱۳]۔ بالآخر ۱۹۹۴ء میں میرے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ میں "جاگیر غالب" کو متعارف اور شائع کرا سکوں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ "جاگیر غالب" کا میرا سارا تعارفی مقدمہ (ص ۱۵-۳۱) فاضل مرتب پرتھوی چندر کی اس علمی کاوش کے نادر و معدوم ہونے کی بحث، کتاب کے چھپنے لیکن اس کی عام اشاعت نہ ہونے کے اسباب پر نظر ڈالنے اور پرتھوی چندر کو متعارف کرانے ہی کے لیے صرف اور وقف ہوا ہے۔

اس پس منظر میں خاکم بدہن چاہتا بھی تو میرے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ پرتھوی چندر کی کتاب کو میں اپنے نام سے چھاپ لیتا!

"جاگیر غالب" کے سرورق پر میں نے اپنے آپ کو "ترتیبِ نو" کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے — اسے اپنی "تالیف" نہیں بتایا۔ کتاب کو اپنے نام سے چھاپ لینے اور اپنے کھاتے میں ڈال لینے کا مکروہ الزام تو اس صورتِ حال میں قابلِ لحاظ ہو سکتا تھا کہ کتاب

میں کہیں اشارتاً بھی پر تھوی چندر کا نام، ذکر یا حوالہ نہ ہوتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پر تھوی چندر اور ان کے علمی اکتسابات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے میرے تعارفی مقدمے سے زیادہ مفصل اور بھر پور کوئی دوسرا ماخذ تنقید و تحقیق میں تلاش کرنا ممکن نہیں۔

پر تھوی چندر کی "جاگیر غالب" نئی ترتیب اور میرے تعارف کے ساتھ لاہور میں چھپی — یہ ممکن نہیں کہ ت۔ف نے کتاب خود نہ دیکھی ہو — بظاہر انھوں نے خود اپنی شہادت یا ذمہ داری پر یہ بات کہنے کی بجائے کہ "پر تھوی چندر کی کتاب اپنے نام سے شائع کرلی" — اسے "سورج" کے حوالے سے درج "گزٹ" کیا ہے — یعنی اگر یہ جھوٹ ہے، تو دروغ برگردنِ راوی! — یہ رویہ مجھے ت۔ف کے علمی مزاج یا ان کی انصاف پسندی سے ہم آہنگ دکھائی نہیں دیتا؟ مجھ سے ان کی کسی شخصی بیزاری کا مظہر معلوم ہوتا ہے —

پاکستان میں اردو کتابوں کا کوئی شخصی ذخیرہ، مشفق خواجہ صاحب کے ذخیرۂ کتب سے زیادہ بھر پور اور مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ پرانی اور تازہ ادبی کتابوں کے بارے میں معلومات اور اطلاعات بھی ان سے زیادہ کسی کے پاس شاید ہی ہوں۔ ان کی شہادت یہ ہے کہ:

> "جاگیر غالب" سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ اس متاعِ گم شدہ کی بازیافت کے لیے وہ سب لوگ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کے ممنون ہوں گے جنھیں غالب سے دلچسپی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں، جب میں ہندوستان گیا تھا تو اس کتاب کو بہت تلاش کیا تھا۔ مگر کتاب کیا ملتی — مالک رام صاحب کے سوا اس کا کوئی دیکھنے والا بھی نہیں

ملا تھا—— مالک رام صاحب کے پاس جو نسخہ تھا، وہ انہوں نے کسی دوست کو دے دیا تھا۔ للذا میں اس کا دیدار بھی نہیں کر سکا—— ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے مقدمے میں کتاب کے طبع ہونے اور شائع نہ ہونے کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات پیش کی ہیں۔ خدا معین صاحب کو خوش رکھے کہ وہ اپنے کاموں سے دوسروں کو خوش رکھتے ہیں——" (مشفق خواجہ، نقوشِ غالب، مطبوعہ، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۷۸)

ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحبان نے بھی میری اس علمی کاوش کو سراہا۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے "جاگیر غالب" پر کسی قدر تفصیل سے لکھا:

"پرتھوی چندر غالبیات سے خاصا ربط رکھتے تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ۱۹۹۴ء میں (ان کی کتاب "جاگیر غالب" کو) غالب شناسوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اس اہم خدمت پر جتنی بھی داد دی جائے کم ہے .... انہوں نے ایک گم گشتہ متاعِ گراں بہا کو پڑھنے والوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے... ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کا یہ کارنامہ اتنا اہم ہے کہ اس کی جس قدر پذیرائی کی جائے کم ہے——"

ہندو یونیورسٹی بنارس کے پروفیسر ڈاکٹر حنیف نقوی فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے غالبیات کو جس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے، وہ قابلِ رشک ہے۔ پرتھوی چندر کی کتاب "جاگیر

غالب" کے بارے میں ادھر ادھر بہت کچھ سن رکھا تھا مگر شدید اشتیاق کے باوجود آنکھیں اس کے دیدار سے محروم تھیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اسے اپنے روایتی سلیقے اور حسن ترتیب کے ساتھ شائع کر کے اردو والوں بالخصوص غالب سے شغف رکھنے والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ غالب شناسی کے توسط سے یہ معین صاحب کی کلاہِ افتخار میں ایک اور طرۂ امتیاز کا اضافہ ہے۔ اس گراں قدر علمی تحفے سے آنکھیں بھی روشن ہوئیں اور دل بھی خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو تادیر زندہ و سلامت رکھے تاکہ وہ اسی طرح غالب کے قدر شناسوں اور اپنے چاہنے والوں کے لیے دیدہ و دل کی روشنی اور شادمانی کا سامان کرتے رہیں ---"

برعظیم کے ممتاز غالب شناس اور صاحب نظر محقق کالی داس گپتا رضا کے اقتباس پر اس قصے کو تمام کرتا ہوں :

"جاگیر غالب" اور "لطائفِ غیبی" پہلے ہی میرے پاس موجود تھیں، مگر آپ کی ایڈیٹنگ کے بعد ان سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے واقعی ان میں دل کش اضافے کیے ہیں جو بے حد کار آمد ہیں ---" (خط بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، بمبئی، ۸ر ستمبر ۱۹۹۶ء)

ت۔ف کے اتہامات کے رد میں مجھے صحیح صورت حال کی وضاحت میں یہ سب کچھ کہنا پڑا۔ یہاں میں رشید احمد صدیقی کی ایک بات تحسین فراقی کو یاد دلانا چاہتا ہوں

گانہ :

"لکھنے والا بڑا ہے، اچھا ہے، معمولی ہے، گھٹیا ہے، ان سب کا دارومدار اس پر ہے کہ اس نے اپنے تحت الشعور کا اظہار کس طور پر کس سطح سے اور کس نیت سے کیا ہے —" (آپ بیتی، رشید احمد صدیقی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۸۶)

حواشی اور حوالے :

۱۔ الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ضخامت ۳۲۶ صفحات

۲۔ دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین"، مرتبین ڈاکٹر سیّد معراج نیر اور اصغر ندیم سیّد، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

۳ تا ۵۔ ایضاً، ص ۵۵، ۵۸ اور صفحہ ۵۹ (علی الترتیب)۔

۶۔ خواجہ منظور حسین صاحب کے بارے میں مرتبین کے محسوسات سیّد معراج نیر اور اصغر ندیم سیّد صاحبان کی مرتبہ کتاب میں اختصار کے ساتھ محفوظ ہو گئے ہیں :

"خواجہ منظور حسین صاحب عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ علم و عقل میں مجھے ان سے کوئی نسبت ہی نہیں تھی — پھر بھی ان سے میرا رشتہ ادب، زبان، قلمی آثار، کتاب شناسی، علی گڑھ، یلدرم، رشید صاحب، وقارِ عظیم، غالب، اقبال، مولوی عبدالحق، گورنمنٹ کالج، کم گوئی، کم آمیزی، گوشہ نشینی، سلیقے، افتادِ طبع، روشِ کار — غرض معلوم نہیں کس کس حوالے سے تھا اور یہ رشتہ اور تعلق کیسا پائیدار اور جان دار اور جاں فزا تھا، اس کا تصور کرنا بھی شاید کسی دوسرے کے لیے ممکن نہ ہو — کوئی اس حساب کتاب میں ضرور پڑے، یہ مقصود بھی نہیں —" (دیوانِ غالب،

نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین، ص ۱۹۱)

۷۔ دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، ص ۴۲

۸۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب وقتاً فوقتاً اپنے دیوان کے اہتمامی نسخے تیار کراتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے نسخوں کی تیاری کے لیے خاصا وقت درکار ہوتا تھا۔ اس لیے غالب کے پاس ان کا پہلے سے تیار شدہ نسخہ موجود رہنا ضروری تھا تاکہ صاحبانِ اقتدار وغیرہ کو پیش کرنے کے لیے ان کی کتابت اور تزئین و تذہیب میں وقت ضائع نہ ہو —" (ڈاکٹر نیر مسعود، ایضاً، ص ۴۹)

۹۔ "نسخۂ خواجہ" ۱۹۸۱ء کے پس و پیش مجھے ملا — یہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے، نواب ضیاء الدین احمد یا کسی دوسرے اہلِ ذوق امیر کبیر کی ملکیت رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۸۱ء تک کے کوئی ایک سو پچیس برس کے زمانے میں اس نسخے کا ایک سے زیادہ ہاتھوں میں رہنا دور از قیاس نہیں ہے۔ اس حد زمانی میں یہ گویا کسی "فتح دین" کا نصیب بھی رہا — جیلانی کامران نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے بتایا ہے کہ "مخطوطے کے اختتام پر ایک عجیب و ستخط بھی موجود ہیں جو اندازے سے کسی "فتح دین" کا نام معلوم ہوتا ہے...... "فتح دین" شاید کوئی ایسا شخص ہوگا جس کی ملکیت میں یہ مسودہ کبھی نہ کبھی رہا ہوگا اور ظاہراً اپنی خوش قسمتی کے طور پر اس نے اپنا نام لکھ دیا ہوگا —" (دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، ص ۱۹۷)

۱۰۔ دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، ۲۰۰۰ء، ص ۸۷، ۸۸

۱۱۔ دیکھئے: دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — تجزیہ و تحسین، ص ۶۴

۱۲۔ بعض حوالوں کے لیے ملاحظہ کیجئے:

(ا) نشریہ، ریڈیو پاکستان، لاہور، ۱۳؍ ستمبر ۱۹۷۶ء
(ب) فنون، لاہور، اگست - ستمبر، ۱۹۸۳ء
(ج) غالب نامہ، دہلی، جنوری ۱۹۸۴ء
(د) نشریہ ریڈیو پاکستان، لاہور، فروری ۱۹۸۴ء
(ہ) نقوشِ غالب، لاہور، ۱۹۹۵ء
(و) تحقیق نامہ، لاہور، شمارہ ۵، سال ۹۶-۱۹۹۵ء

۱۳۔ دیکھئے: (ا) نقوش، لاہور، شمارہ ۱۳۶، دسمبر ۱۹۸۷ء
(ب) تحقیق اور تلاش، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی، نقوش غالب، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۵۲-۳۵۷

o o

"غالب کے مطالعات میں ایک نام جو گذشتہ دو دہائیوں سے اربابِ فکر و نظر کو متوجہ کرتا رہا ہے، پروفیسر سیّد معین الرحمٰن کا ہے۔ سیّد معین الرحمٰن نے براہِ راست غالب پر یا غالب سے متعلق کئی موضوعات پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ اکثر لوگوں کے لیے وہ سرمایۂ حیات کا حکم رکھ سکتا ہے لیکن سیّد معین الرحمٰن نے غالب سے متعلق تحقیق و تنقید اور تاریخ کے علاوہ اور بھی علمی کاوشیں اربابِ علم کے سامنے پیش کی ہیں۔۔۔ صرف غالب پر ان کی تحریروں کو بحث میں لائیں تو وہ اُن کے حیرت انگیز تفحص، دقیقہ رسی اور صلابتِ فہم کی دلیل ہیں۔ اُن کی کتاب "غالب اور انقلابِ ستاون" بھی اسی وقتِ نظر کی مظہر ہے۔ اور اب، "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" کی ترتیب و تدوین ـــ واللہ، ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

کہا گیا ہے کہ اکثر بڑی دریافتیں حسنِ اتفاق پر مبنی ہوتی ہیں اور ایسی خوش نصیبی اُنھیں کے حصّے میں آتی ہے جو اِس کے مستحق ہوتے ہیں۔ تحقیق و تلاش میں جان کھپا دینے اور علم کے حصول میں ہر ممکن کوشش کرنے والے ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ گوہر شب چراغ اُن کے ہاتھ لگتا ہے۔ سیّد معین الرحمٰن کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ وہ ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں، نوادر جن کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ایک نادر دیوانِ غالب، مکتوبہ ۱۸۵۲ء کو انھوں نے اپنے بزرگ، انگریزی کے مشہور عالم خواجہ منظور حسین مرحوم سے نسبت دے کر "نسخۂ خواجہ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس سعادت مندی اور قدر شناسیِ بزرگان کی جتنی ثناء ہو، کم ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ معین الرحمٰن نے اس دولتِ بے بہا کو شائع کر کے عام کر دیا ہے۔ اُنھوں نے یہ نسخہ، حسن اور صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں انھیں دس سال سے زیادہ کی مدت لگی، لیکن یہ کام ایسی ہی محنت کا تقاضا کرتا تھا۔۔۔"

الہ آباد، نومبر ۱۹۹۹ء ـــ شمس الرحمٰن فاروقی

"دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ" بے حد قیمتی نسخہ ہے۔ ماشاء اللہ معین الرحمٰن صاحب نے حسبِ معمول بڑی محنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اِس کا اجر عظیم عطا فرمائے، آمین!

سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد، ۲ / دسمبر ۱۹۹۸ء ——— پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

"دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" گراں بہا تحفہ ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن قلمی نسخے کی اہمیت اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تصریحات اور محققانہ حواشی اور تعلیقات کی وجہ سے جملہ پیش رو دواوینِ غالب، پر غالب ہے۔ معین صاحب نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ یہ ایڈیشن اُن کی محنت و محبت کا ثمر ہے بلکہ عشق کا مظہر ہے۔ اس دیوان کی طباعت سے انھوں نے اس زمین میں کام کرنے والوں کو گرویدۂ احسان بنالیا ہے۔ جزاک اللہ اور مبارک باد!

سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد، ۲۵ / مارچ ۱۹۹۹ء ——— ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ، غالب کے ایک اونی سے چاہنے والے کی حیثیت سے میرے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے ——— وہ کام جو سالم ادارے، کمک، اسباب، اور ہیاھو کے باوجود نہیں کر سکتے، وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب خاموشی سے، تنہا اور یکے بعد دیگرے کیسے کر لیتے ہیں؟

لاہور، ۹ / فروری ۱۹۹۹ء ——— مختار مسعود

"——— غالب کو اپنی تحقیق کا مرکز بنا کر میں کبھی لاحاصلی کی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا ——— غالب پر اپنی پہلی کتاب "اشاریۂ غالب" (۱۹۶۹ء) سے لے کر اپنے تازہ ترین تحقیقی کام "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ" (۱۹۹۸ء) تک کے یہ تیس برس میرے لیے ایک غیر منقطع سلسلۂ نعمت کی حیثیت رکھتے ہیں ——— "نسخۂ خواجہ" کی بازیافت اور تدوین کو میں خود بھی اپنے کاموں میں اہمیت دیتا ہوں ——— اس کی متنی تنقید و تحقیق میں مجھے پندرہ سترہ برس لگے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول اس کام نے مجھے نچوڑ ڈالا اور میری صحت سقیم ہو گئی ——— لیکن اس کام کو اہلِ علم و نظر نے جس طرح سراہا، وہ میرے لیے ایک بڑا انعام اور امتیاز ہے۔ زندگی اور صحت تو بالآخر چلی جانے والی ہی چیز ہے ——— لیکن، کوئی باقی رہ جانے والا علمی کام ممکن ہو سکے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں!"

لاہور، ۱۴ / اکتوبر ۱۹۹۹ء ——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن